فیضان معرفت

جلد اول

افادات

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم
بانی ومہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور
خلیفہ مجاز بیعت
حضرت اقدس مولانا مفتی مظفر حسین صاحب نور اللہ مرقدہ

مرتب
محمد زبیر قاسمی
استاذ جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم

فہرست عناوین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عارفانہ نظم

از: مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب ظرفی دامت برکاتہم

نام حق تعالیٰ جو جم گیا ہے سینے میں
پارہا ہوں بے شک میں لطف وکیف جینے میں
مست ہو جو فانی میں کیا خبر اسے اس کی
کیا مزہ ہے مخفی اس عشقِ حق کے پینے میں
عشقِ حق میں مرنا ہی ، قرب حق کا رستہ ہے
شوق گر ہو مرنے کا رکھ قدم سفینے میں
گر تجھے محبت کا ذاتِ حق سے ہو دعویٰ
مان لے محمدؐ کی جو ہوئے مدینہ میں
عشقِ حق میں مرنے پر زندگی نئ دے دی
ہر قدم فنا کا اب ہے بقا کے زینے میں
خالق دو جہاں وہ مالک دو عالم وہ
شان کبریا راسخ دل کے ہے نگینے میں

کر سوال حاجت کا تو خدائے برتر سے
ساری دولتیں ہیں جس ذات کے خزینہ میں
شیخ باخدا سے تم معرفت کی راہیں لو
یہ علوم عرفانی ہیں کہاں سفینہ میں
تیرا ہی رہے ظرفی اس لئے خدا یا تو
سوز غم اسے دے دے دل کے آ بگینے میں

تمہید

حامدًا و مصلیاً:

اللہ رب العزت اپنی کتاب مبین میں فرماتے ہیں:''قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى'' **ترجمہ**: تحقیق کہ فلاح پا گیا وہ شخص جو تزکیہ حاصل کرلیا)(یعنی جو اپنے قلب وقالب کو عقائد صحیحہ، اخلاق فاضلہ، اور اعمال صالحہ سے مزین کیا وہ کامیاب ہوا) تزکیۂ نفس کا ذکر قرآن کریم میں دیگر مقامات پر بھی مختلف سیاق وسباق میں وارد ہوا ہے، ایک جگہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں بھی باری تعالیٰ نے اس کا ذکر فرمایا ہے، چناں چہ ارشاد باری ہے:'' لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ ''**ترجمہ**: اللہ نے احسان کیا ایمان والوں پر جب کہ انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اللہ کی آیتیں تلاوت کرتا ہے، اوران کے نفوس کا تزکیہ کرتا ہے، الخ۔

ایک اور جگہ تو کامیابی کا معیار ہی تزکیۂ نفس کو قرار دیا گیا ہے:'' قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا''**ترجمہ** : تحقیق وہ کامیاب ہوا جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا، اور نامراد ہوا وہ جو اس کو ملوث کیا) معلوم ہوا کہ نفس کی اصلاح کرنا، اسے رزائل سے پاک کرنا، اور اعمال صالحہ کا خوگر بنانا، یہ دین اسلام کا بنیادی مقصد اور شریعت کا عین مقتضیٰ ہے۔

اور عادۃ اللہ ہمیشہ یہ رہی ہے کہ کتاب اللہ کے ساتھ رجال اللہ بھی بھیجے گئے اور پھر انبیاء کے بعد ان کے نائبین وو ارثین کا سلسلہ قائم و جاری رہا، اور جس طرح دنیا میں کسی بھی علم وفن کی تحصیل کے لئے رہبر و استاذ کی ضرورت پڑتی ہے، اسی طرح اپنے باطن کو بنانے اور دل کو معرفت الٰہیہ کے نور کا مسکن بنانے اور محبت خداوندی سے معمور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہر زمانہ میں امت میں ایسے نفوس پیدا فرمائے ہیں، جو مختلف تدابیر سے امت مسلمہ کی اصلاح میں کوشاں رہتے ہیں، کوئی تدریس سے، کوئی تصنیف وتالیف سے، تو کوئی وعظ ونصیحت سے، انہیں طریقوں میں سے اللہ والوں اور بزرگان دین کی مجالس بھی ہیں، جس کا فائدہ امت کو برابر ہوتا رہا ہے، جس سے ایک خلق کثیر اکتساب فیض کرتی رہی ہے، اور ان مجالسوں سے ایسے لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں، جو اپنے باطن کو آراستہ کرکے ستاروں کے مانند امت کے لئے مشعلِ راہ بنتے ہیں، انہیں مجالس میں سے استاذی ومربی ومخدومی حضرت اقدس مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم کی مجالس بھی ہیں، جو طلبہ کے لئے مدرسہ میں ظہر بعد اور عوام کے لئے ہر اتوار بعد نماز مغرب تا عشاء ہوتی ہیں، زمانہ طالب علمی ہی سے بندہ کے دل میں داعیہ تھا کہ حضرت والا کی مجالس کے بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک لڑی میں پرودوں، مگر تعلیمی مصروفیات مانع بن رہے تھے، اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرتا تھا کہ اے اللہ! اس عاجز سے ان بیانات کو جمع کرنے کا کام لے لے، **الحمد لله**، اللہ تعالیٰ کی توفیق اور نصرت سے اس مجموعہ کو ٹیپ رکارڈ کی مدد سے ان بیانات میں سے اصلاح قلب وتزکیۂ نفوس سے متعلق باتوں کو مختلف عناوین کے تحت جمع کرکے ایک کتابی شکل دینے کی سعادت نصیب ہوئی، چونکہ ان مجالس کا مجموعہ اور مواد زیادہ تھا، اور خدشہ ہوا کہ کہیں کتاب کی طوالت قاری کو اکتا نہ دے، اس لئے اختصار کے پیش نظر اس مجموعہ کو جلد وار لانے کا ارادہ ہے، یہ

پہلی جلد ہے ان شاء اللہ بقیہ جلدیں بھی بہت جلد آئیں گی۔ (**فانتظروا انی معکم من المنتظرین**)

بندہ نے اس مجموعہ کو مرتب کرنے کے بعد حضرت والا کی خدمت میں پیش کیا اور درخواست کی کہ آپ اس پر نظر فرمالیں اور طبع کرانے کی اجازت عطاء فرمائیں، تو حضرت الاستاذ نے بخوشی اجازت دی اور از اول تا آخر نظر ڈالی، اور بعض جگہ جہاں تشنگی محسوس کی اس کی وضاحت فرمائی اور کتاب میں ذکر کردہ احادیث کی تخریج کا حکم دیا اور مفید مشوروں سے نواز کر خاکسار کی ہمت افزائی فرمائی۔

میں ممنون ومشکور ہوں ان تمام حضرات کا جنہوں نے اس کی ترتیب میں میرا تعاون فرمایا، بالخصوص مولانا محمد یاسین خان صاحب قاسمی مدرس جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم جنہوں نے اپنی وہ کاپیاں جن میں انہوں نے ملفوظات جمع کئے تھے عطاء کئے، اور مولانا اسماعیل خان صاحب قاسمی اور حافظ عبد المصور صاحب مسیحی جنہوں نے اس کتاب کی ٹائپنگ میں بھرپور تعاون فرمایا، اللہ پاک جملہ معاونین کو اجر جزیل عطاء فرمائے اور اس مجموعہ سے امت کے ہر خاص وعام کو نفع پہنچائے اور میرے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین۔

محمد زبیر احمد قاسمی
مدرس جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم
۱۸ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی خاتم المرسلین وعلی اٰلہ وأصحابہ أجمعین .

وصول الی اللہ میں تاخیر کی وجہ

فرمایا: اہل اللہ کی صحبت حاصل ہونے کے باوجود جن جولوگوں کوسلوک طے کرنے میں دیر ہورہی ہے اور وصول الی اللہ نصیب نہیں ہورہا ہے، ان کو یہ بات سمجھ لینا چاہئے کہ وہ ضرور کسی نہ کسی گناہ میں مبتلا ہیں، ذکر بھی کرتے ہیں، مگر ذکر سے جہاں نور پیدا ہوا بدنظری کر کے یا کوئی اور گناہ کر کے، اس کو بجھا دیتے ہیں، عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی نیکیاں کرنے کا اہتمام کرتا ہے، لیکن گناہوں سے بچنے کا اہتمام نہیں کرتا، نیکی کرنے سے نور پیدا ہوتا ہے، مگر جب انسان گناہ کرتا ہے، تو وہ نور ختم ہوجا تا ہے، جس طرح کوئی ایک طرف سے آگ جلائے، اور دوسری طرف سے بجھادے، اس طرح یہ آنکھ مچولی جیسا کھیل ہوجا تا ہے، یہاں تک کہ وہ آدمی جہاں تھا، وہیں رہتا ہے، اور کبھی اس کو وصول نصیب نہیں ہوتا، جیسے ایک برتن ہو، جس میں نیچے سوراخ ہوں، آپ اس میں دودھ ڈال دیں، تو نیچے سے خالی ہوتا رہے گا، اسی طرح نماز پڑھتا ہو، ذکر کرتا ہو، مگر دل میں تکبر ہو، غیبت کرتا ہو، بدنظر میں مبتلا ہو، تو نیکیاں بھی اسی طرح خالی ہوتی رہیں گی، اس لئے سالک کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ گناہ ہرگز نہ کرے، اپنے آپ کو تمام قسم کے گناہوں سے بچانے کی پوری پوری کوشش ہونی چاہئے۔

اگر کوئی ہدایت پانا چاہے

جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دینا چاہتے ہیں، تو عالم اور کائنات کا ہر ذرہ اس کے لئے ہدایت کا ذریعہ بن جاتا ہے، ہر واقعہ سے کوئی نہ کوئی بات وہ نکال لیتا ہے، اور جس آدمی کو ہدایت نہیں ملنی ہے، اس کے سامنے قرآن پیش کیجئے، حدیث پیش کیجئے، دلائل کے انبار جمع کر دیجئے، لیکن اس سے وہ کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھاتا۔

جسے اللہ ہدایت دیتا ہے تو وہ چڑیوں سے بھی ہدایت پالیتا ہے، کتوں سے بھی ہدایت پالیتا ہے، حتی کہ خنزیر سے بھی ہدایت پالیتا ہے، ایک بزرگ نے خنزیر سے متعلق فرمایا کہ مجھے اس سے ہدایت ملی، اور ہدایت یہ ملی کہ یہ جانور جس کو لوگ عام طور پر گندا جانور کہتے ہیں، یہ بالکل صبح صبح اٹھتا ہے اور تمام جانوروں سے پہلے اپنی روزی کی تلاش میں نکل جاتا ہے، فرمایا کہ اس سے بھی ہم کو عبرت حاصل ہوئی اور ہدایت ملی کہ صبح جلدی اٹھنا چاہئے، اور یہ کہ اپنے کام میں لگ جانا چاہئے۔

ایک بزرگ نے فرمایا کہ مجھے بلی سے ہدایت ملی، اور ہدایت یہ ملی کہ بلی کو دیکھا کہ وہ چوہے کو پکڑنے کے لیے ایک ایک گھنٹہ مراقبہ میں بیٹھ جاتی ہے، ایسا مراقبہ کہ نہ ادھر ہوتی ہے اور نہ ادھر ہوتی ہے، چوہے کی فکر میں بیٹھی رہتی ہے، فرمایا کہ اسی طرح ہم کو اللہ کے لیے پورے خشوع وخضوع کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہو جانا چاہئے۔ اگر انسان ہدایت پانا چاہتا ہے تو کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے لیے ہدایت بن جاتا ہے۔

نماز میں دل نہیں لگتا

ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت بہت کوشش کرتا ہوں کہ نماز میں یکسوئی ہو، مگر دل میں طرح طرح کے خیالات ووساوس آتے رہتے ہیں، حضرت نے پہلے خواجہ مجذوب کا شعر سنایا:

دل کیوں نہیں لگتا طاعتوں میں اس فکر کے پاس بھی نہ جانا
دل لگنا کہاں ہے فرض تجھ پر ترا فرض تو ہے دل لگانا

پھر ارشاد فرمایا: پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، کیونکہ جب ہم بالقصد کسی چیز کی طرف دیکھتے ہیں تو بالتبع اُس کے آس پاس کی چیزیں بھی نظر آنے لگتی ہیں، حالانکہ اُنکو دیکھنا ہمارا مقصد نہیں ہوتا، بعینہ اسی طرح نماز میں ہمارا مقصد صرف اللہ تعالی کو یاد کرنا اور اُس کی طرف پوری توجہ کو مبذول کرنا ہوتا ہے، مگر پھر بھی دل میں دوسروں کی یاد اور وساوس آتے جاتے رہیں، تو یہ نماز کے لئے مضر نہیں، اور خشوع کے خلاف بھی نہیں، ہمارا کام تو صرف دل لگانا ہے۔

ہاں اپنے قصد وارادے سے کسی اور طرف توجہ کرنا، اور ادھر اُدھر کی باتیں سوچنا، یہ خلاف خشوع ہے۔

یہ تو تمہارے ماتم کا دن ہوگا

بیشتر مجلسوں میں حضرت نے اپنا واقعہ سنایا کہ میں نے ایک مرتبہ اپنے شیخ ومرشد واستاذ حضرت مسیح الامت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھا جس میں میں نے پوچھا کہ حضرت! کتنا ہی خشوع وخضوع ودل جمعی کے ساتھ نماز پڑھتا ہوں، مگر پھر بھی نماز کے بعد دل میں یہ خیال آتا ہے، کہ نماز جیسی پڑھنی تھی ویسی نہیں پڑھ سکا، ابھی کچھ نقص باقی ہے، تو حضرت نے بہت ہی عجیب جواب لکھا جس میں فرمایا: کہ یہ خیال تو ٹھیک ہے، اور جس دن یہ خیال کرلیا کہ آج میں نے نماز کما حقہ اداء کی ہے، وہ تو تمہارے ماتم کا دن ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ آدمی کو کبھی بھی اپنی عبادت وریاضت پر ناز نہ ہونا چاہئے، بلکہ ہر وقت یہی خیال کرنا چاہئے کہ ہم سے اللہ کے شایان شان کچھ نہ ہوسکا، اور اگر

کسی نے یہ سمجھا کہ میں نے بڑی شاندار عبادت کی ہے اور اس پر اترانے لگا، اور بڑائی کرنے لگا، تو یہ اس کے لئے رسوائی کا سبب ہوگا۔

اپنے آپ کو مٹادو

ایک مرتبہ مجلس میں بتی جل رہی تھی، حضرت نے اسے دیکھ کر فرمایا: اس سے عبرت حاصل کرو کہ یہ اپنے وجود کو مٹا کر دوسروں کو نفع پہنچاتی ہے، اسی طرح انسان بھی جب تک اپنے آپ کو مٹا نہیں دے گا، اس وقت تک امت کو فائدہ نہیں پہنچا سکے گا۔

غصہ بقدر ضرورت ہو

ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر نصیحت کی درخواست کی، آپ ﷺ نے فرمایا: **لَاتَغْضَبْ** (غصہ مت کرو)، ان صحابی نے دوبارہ نصیحت کی درخواست کی، آپ ﷺ فرمایا کہ: **لَاتَغْضَبْ** (غصہ نہ کرو)، وہ صحابی تیسری مرتبہ بھی یہی درخواست کرتے ہیں، اور آپ ﷺ پھر بھی یہی فرماتے ہیں: **لاتغضب** (غصہ نہ کرو)

(بخاری شریف: ۵۶۵۱، ترمذی شریف: ۱۹۴۳)

اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: پہلوان وہ نہیں جو لوگوں کو پچھاڑ دے، پہلوان تو وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔

(بخاری شریف: ۵۶۴۹، مسلم شریف: ۴۷۳۳)

اس لئے غصہ سے پرہیز کرنا چاہئے، اور اگر ضرورت پڑے تو بقدر ضرورت ہی غصہ ہونا چاہئے، میں اس کی ایک مثال عرض کرتا ہوں، دیکھو پریس (استری) میں ایک

دو تین وغیرہ نمبرات لکھے ہوتے ہیں، جس سے پریس کو بقدر ضرورت گرم اور ٹھنڈی کرتے ہیں، اور یہ الگ الگ قسم کے کپڑوں کے لئے الگ الگ ڈگری استعمال کی جاتی ہے، اوراس کے خلاف کرنے سے نقصان اُٹھانا پڑتا ہے، اگر باریک کپڑے کو پریس کرنے لئے زیادہ گرم کرلیا جاے، تو کپڑا جل جائے گا، اگر موٹے کپڑے کیلئے ہلکا گرم کیا جاے تو پریس کا کوئی اثر نہیں ہوگا، اسی طرح غصہ بھی مغضوب علیہ کی حالت کے اعتبار سے ہونا چاہیئے ، پھر فرمایا: آئے دن طلاق وخلع کے واقعات وغیرہ اسی لئے رونما ہوتے ہیں کہ بے موقعہ شوہر غصہ ہوجاتا ہے یا بیوی غصہ ہوجاتی ہے، اگر غصہ بقدر ضرورت ہوتو یہ سارا فساد ختم ہوگا۔

اس لئے میں کہتا ہوں کہ غصہ کے بارے میں تین باتوں پر غور کرنا ضروری ہے: ایک یہ کہ غصہ کب کیا جائے ، دوسرے یہ کہ کیسا کیا جائے ، اور تیسرے یہ کہ کتنا کیا جائے؟

کب کیا جائے؟ جب شریعت اس کی اجازت دے ، لہذا اگر شریعت کی اجازت کے بغیر غصہ کیا جائے گا تو گناہ لازم آئے گا، کیسا کیا جائے؟ یعنی کس طریقہ پر غصہ کا اظہار کیا جائے؟ گالی گلوچ نہ ہو، عار نہ دلائی جائے ، غصہ میں آکر اول فول نہ بکے، بعض لوگ جب یہ دیکھتے ہیں کہ ضرورت پر غصہ کیا جا سکتا ہے تو اس کا خیال نہیں کرتے کہ غصہ کس طرح کرنا چاہیئے ، اس کے کیا حدود ہیں؟ اور کتنا کیا جائے؟ اس کے بارے میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ جس طرح پریس کرنے میں کپڑوں کی مختلف قسموں کا لحاظ رکھ کر اس کے موافق اس کو گرم کرنا چاہیئے ، اسی طرح کسی کو ایک ڈگری غصہ کی ضرورت ہے تو اسی قدر غصہ کرے اور کسی کے لئے دو ڈگری کی ضرورت ہے تو دو ڈگری استعمال کرے، اس سے زائد غصہ کرے گا تو یہ ناجائز بھی ہوگا اور بے

فائدہ بھی۔

اپنے نفس کے لئے غصہ نہ کرے

پھر فرمایا کہ کوئی بھی اپنے ماتحت لوگوں پر غصہ کرے تو اپنے نفس کے لئے نہ کرے، بلکہ اُسی کے فائدہ کے لئے ہونا چاہئے، جیسے اُستاذ کسی طالب علم کی اصلاح کے لئے غصہ کرتا ہے، یہ طالب علم کے فائدہ کے لئے ہو، اپنے نفس کیلئے نہ ہو، اور اُس کو جانچنے کا طریقہ یہ ہے کہ مثلاً اُستاذ کسی طالب علم پر غصہ ہوا، متصلاً بعد کوئی دوسرا طالب علم اُس اُستاذ کے پاس کسی ضرورت سے جائے تو اُستاذ اُس پر بھی خواہ مخواہ غصہ ہو جائے تو یہ اپنے نفس کے لئے غصہ ہوا، نہ کہ اصلاح کے لئے، غصہ صرف اُسی پر ہونا چاہئے جو غلطی کرے، پھر دوسروں سے بات کرے تو نرمی برتے، پھر فرمایا یہ لوہے کے چنے چبانے سے زیادہ مشکل ہے۔

غصہ کی بھی ضرورت ہے

فرمایا: جب یہ کہا جاتا ہے کہ غصہ نہ کرو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ خلاف شریعت یا خلاف فطرت چیزیں دیکھنے کے بعد بھی بالکل غصہ نہ کیا جائے، بلکہ امام شافعی نے تو یہاں تک فرمایا کہ: برموقعہ جس کو غصہ نہ آئے وہ گدھا ہے، لھذا غصہ فی ذاتہ ممنوع نہیں، بلکہ حد سے زیادہ یا بے موقعہ غصہ ممنوع ہے۔

بدگمانی کا موقعہ دینا بھی غلط ہے

فرمایا: جس طرح کسی کے بارے میں بدگمانی کرنا جائز نہیں، اسی طرح بدگمانی کا موقعہ فراہم کرنا بھی جائز نہیں، مگر آج لوگ صرف بدگمانی کرنے کو غلط سمجھتے

ہیں، حالانکہ بدگمانی کا موقعہ دینا اور زیادہ غلط بات ہے، پھر حضرت والا نے اس بات کو مدلل کرتے ہوئے بخاری شریف کی ایک حدیث بیان فرمائی: آپ ﷺ مسجد میں رمضان کے آخر عشرہ میں اعتکاف میں تھے، آپ کی بیوی حضرت صفیہ بنت حی رضی اللہ عنہا آپ سے ملنے آئیں، کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد جانے لگیں، تو آپ ﷺ ان کو چھوڑنے مسجد کے دروازہ تک آئے، تو دو انصاری آدمی وہاں سے گذرے، اور انہوں نے آپ ﷺ کو سلام کیا، تو آپ نے فرمایا: خبردار! یہ صفیہ ہے، (یعنی یہ گمان نہ کرو کہ کوئی دوسری عورت میرے پاس ہے بلکہ یہ میری ہی بیوی صفیہ ہے) تو ان دونوں نے کہا کہ سبحان اللہ! یارسول اللہ (یعنی ہم آپ کے بارے میں کیسے بدگمانی کر سکتے ہیں) اور ان پر یہ بات شاق گذری، تو آپ ﷺ نے فرمایا: شیطان انسان میں خون کی طرح دوڑتا ہے، اس لئے مجھے خوف ہوا کہ وہ کہیں تمہارے دل میں بد گمانی نہ پیدا کردے۔

(بخاری:۱۸۹۳، مسلم:۴۰۴۱)

انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء کی تفسیر

رمضان میں دورانِ تفسیر حضرت نے فرمایا: یہاں اس آیت میں علماء سے مراد وہ علماء نہیں، جو کسی دینی ادارہ کے سند یافتہ ہونے کی وجہ سے مولوی کہلاتے ہیں، اس لئے کہ نزولِ قرآن کے وقت نہ یہ مدارس تھے، نہ سندیں تھیں، نہ دستاریں تھیں ، نہ دستار بندیاں ہوتی تھیں، اس لئے اس آیت میں علماء سے مراد یہ لوگ نہیں ہیں، بلکہ مراد اللہ کو جاننے والے ہیں جن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اللہ کا خوف اپنے دلوں میں رکھتے ہیں۔

حضرت حسن بصری نے فرمایا ہے کہ:

إنما الفقيه الزاهد في الدنيا؛ البصير بدينه؛ المداوم على عبادة ربه.

کہ فقیہ یعنی عالم وہ ہے جو دنیا سے زہد اختیار کرے، اور اپنے دین میں بصیرت رکھے اور اپنے رب کی عبادت پر دوام و پابندی رکھے۔

حضرت سفیان بن عیینہؒ کی ایک بات یاد آ گئی، تاریخ بغداد میں آپ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ:

انما العلم ليتقى الله به، ويعمل به لآخرته، ويصرف عن نفسه سوء الدنيا و الآخرة ، و الا فالعالم كاجاهل اذا لم يتق الله بعلمه۔

(تاریخ بغداد: ۲۱۳/۴)

یعنی فرماتے ہیں کہ علم تو اس لئے ہے کہ اللہ سے ڈرا جائے، اور آخرت کے لئے عمل کیا جائے اور دنیا اور آخرت کے برائی کو دور کیا جائے، ورنہ تو عالم جاہل کے مانند ہے اگر وہ اللہ سے ڈرتا نہیں۔

لہذا جو بھی عالم باللہ ہوگا، اور اللہ کا خوف رکھتا ہوگا، اگر چہ وہ عالم بالکتب نہ ہو، وہ اس آیت کریمہ کا مصداق ہوگا، ہاں اگر کوئی عالم بالکتب ہونے کے ساتھ ساتھ عالم باللہ بھی ہو تو نور علی نور ہے۔

یہ ہے اصطلاح قرآن وسنت میں عالم کی تعریف، صرف مدرسے میں داخل ہوا اور تصدیق وسند لیکر آ گیا تو وہ قرآن وحدیث کی زبان میں عالم نہیں ہو جاتا۔

لفظ مولوی کا معنی

ہمارے حضرت مسیح الامتؒ فرمایا کرتے تھے کہ لفظ مولوی میں یائے نسبتی ہے،

جیسے دہلوی، دہلی والا، بنگلوری، بنگلور والا، کرناٹکی، کرناٹک والا، میں یاءنسبت کی ہے، اب مولوی کے معنی ہوں گے مولیٰ والا، اللہ والا، لہذا جو اللہ والا نہ ہو وہ مولوی ہرگز نہیں ہے۔

عبرت آموز حکایت

مولانا رومی نے ایک حکایت لکھی ہے کہ دو چور ایک گھر میں داخل ہوئے اور انہوں نے یہ طے کیا کہ جب گھر کا مالک روشنی کے لئے چقماق کو رگڑ کر روشنی جلائے گا، تو ان میں سے ایک انگلی رکھ کر اس کو بجھا دے گا، اور یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب کہ بجلی کا کوئی انتظام نہیں تھا، چقماق کے پتھر ہوتے تھے، جن کو ایک دوسرے پر رگڑتے تو آگ پیدا ہو جاتی تھی، تو دو چوروں نے یہ طے کیا کہ ہم لوٹنا شروع کریں گے اور جب گھر والا جاگ کر، بیدار ہو کر، چقماق سے روشنی جلانا چاہے گا، تو ایسی صورت میں ایک چور صرف یہ کام کرے کہ جیسے ہی وہ آگ جلائے، اس پر ہاتھ رکھ دینا، نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ چقماق کا پتھر کبھی جلنے کا نہیں، اور اس وقت تک دوسرا چور سب لوٹ لے گا، چناں چہ ایسا ہی کیا اور گھر کو ان چوروں نے لوٹ لیا۔

مولانا رومیؒ نے کہا کہ شیطان بھی اسی طرح بعض سالکین کے دل پر انگلی رکھ دی ہے، تا کہ نور ختم ہو جائے، سالک اگر کوئی نیکی کر رہا ہے تو یوں سمجھو کہ وہ چقماق کا پتھر رگڑ رہا ہے، اور شیطان اس پر انگلی رکھ دیتا ہے، یہ انگلی وہی معصیت اور گناہ ہے، جب گناہ ہوتا ہے تو وہ نیکی کی روشنی بجھ جاتی ہے، سالک نے اللہ اللہ کی، تلاوت و ذکر کیا، شیطان نے فوراً ہی اس کی آنکھوں سے کسی عورت کو دکھا دیا، اور اس کے عشق میں اس کو مبتلا کر دیا، دل میں گندے خیالات پیدا کر دیا، اسی طرح گناہوں

میں عمر گذر گئی، اور یہ شخص صاحب نسبت بن نہ سکا۔

واقعی بڑی عبرت کی بات ہے، ہر سالک کو اس پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے ،بعض سالکین رات دن خانقاہوں میں رہتے ہیں، اولیاءاللہ کی صحبت میں ہیں، ذکر وتلاوت بھی کرتے ہیں، لیکن گناہوں سے نہیں بچتے، اور ان کا نور تام نہیں ہوتا اور یہ محروم رہ جاتے ہیں۔

گناہ زہریلا سانپ ہے

جو یہ چاہے کہ وہ اللہ والا بن جائے تو وہ گناہ سے ایسا بچے جیسا کوئی سانپ سے بچتا ہے، سانپ کو دیکھئے بڑا حسین وجمیل لگتا ہے، جو اس کے زہر سے واقف نہیں ہوتا وہ اس پر ہاتھ رکھ دے گا کہ ماشاءاللہ! کتنا اچھا لگ رہا ہے، اس کو لیجا کر پالا کروں گا، اور یہ اس کی جہالت ہے، اور جو اس کے زہر سے واقف ہوتا ہے، وہ یہ کہے گا کہ اس سے بچو دور بھاگو، کیوں کہ یہ دیکھنے میں جتنا خوبصورت ہے اندر سے اتنا ہی زہریلا ہے، چناں چہ علماء حیوانات نے لکھا ہے کہ جو سانپ جتنا زیادہ خوبصورت ہوتا ہے، وہ اتنا ہی زہریلا ہوتا ہے، اور جو زیادہ خوبصورت نہیں ہوتا، اس میں زہر بھی کم ہوتا ہے، ناگ سانپ کو دیکھ لیجئے کہ اس کا پھن زیادہ خوبصورت ہوتا ہے، مگر اس کا کاٹا ہوا زندہ نہیں بچتا، اس کا ایک ڈسنا انسان کو ہلاک کر دیتا ہے، اسی طرح گناہ کرنے میں بھی بظاہر لذت ملتی ہے، مگر اس کا انجام بڑا خطرناک ہوتا ہے، بزرگوں نے کہا کہ گناہ سے اس لئے بھی بچو کہ گناہ انسان کو اپنے محبوبِ حقیقی اللہ سے دور کر دیتا ہے، جب آدمی گناہ کرتا ہے، تو اس کی وجہ سے دوری پیدا ہو جاتی ہے اور جتنا زیادہ گناہ کرے گا اسی قدر دوری بھی زیادہ ہوگی۔

عبادت میں لذت کیوں نہیں آتی؟

جب آدمی گناہ کرتا ہے تو عبادت کی لذت سے محروم ہو جاتا ہے، عبادات کا مزہ اس کو آتا ہے جس کا دل صحیح سالم ہو، کوئی بیماری کا شکار نہ ہو، اور اس کے مزاج کے اندر کوئی فتور نہ ہو، جیسے صحت مند انسان جب بریانی کھاتا ہے تو بریانی کا مزہ آتا ہے، حلوہ کھاتا ہے تو حلوہ کا مزہ آتا ہے، کھارا کھاتا ہے تو کھارے کا مزہ آتا ہے، میٹھا کھاتا ہے تو میٹھے کا مزہ آتا ہے، لیکن جس کی طبیعت میں فساد پیدا ہو جائے صفراء کی بیماری یا اور کسی بیماری کی وجہ سے، تو اب وہ کھائے گا تو مزہ نہیں آئے گا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو نماز میں مزہ نہیں آتا، اس کی کیا وجہ ہے؟ میں کہتا ہوں کہ بیشک مزہ نہ آنے کی کوئی وجہ ہوگی، کسی آدمی کو بریانی کھانے کے باوجود مزہ نہیں آئے تو کیا وہ ڈاکٹر کو نہیں بتائے گا، اسی طریقہ پر جس آدمی کو ذکر و نماز میں مزہ نہیں آئے، تو اسے یہ سمجھنا چاہئے کہ اس کا دل بیمار ہے، گناہوں کی وجہ سے اس کی طبیعت میں فساد پیدا ہو گیا ہے، اس لئے مزہ نہیں آرہا ہے۔

ہاں ایک بات اور سن لیں کہ مزہ نہ آئے تو اس کا علاج تو کرانا چاہئے مگر عبادت نہیں چھوڑنا چاہئے، بعض لوگ مزہ نہ آنے پر عبادت ہی چھوڑ بیٹھتے ہیں، یہ حماقت کی بات ہے۔ جیسے کسی کو بریانی کھانے میں مزہ نہ آئے تو علاج تو کرانا چاہئے مگر یہ بے وقوفی نہیں کرنا چاہئے کہ کھانا ہی چھوڑ دے، ورنہ مر ہی جائے گا، اسی طرح اب عبادت جو ہو رہی ہے بلا مزہ ہی سہی، ہو تو رہی ہے، اور اس کی وجہ ایمان کی رمق تو باقی ہے، اگر یہ بھی چھوڑ دے گا تو اس کے ایمان کا کیا ہوگا؟

مزہ نہ آئے تو دوا سمجھو

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت مجھے ذکر ونماز میں مزہ نہیں آتا، حضرت نے فرمایا کہ بھائی عبادت میں مزہ آئے تو غذاء سمجھواور مزہ نہ آئے تو دواء سمجھو، اوراس کو کرتے رہو، اگر مزہ نہ آئے تو عبادت چھوڑ نا نہیں چاہئے، بلکہ یہ سمجھ کر کرنا چاہئے کہ وہ دواء ہے، جیسے ٹانک پینے سے کیا مزہ آتا ہے؟ گولی کھانے سے کیا مزہ آتا ہے؟ اور اگر انجکشن لینا پڑے تو اس میں چرکا لگتا ہے، مزہ تو وہاں نہیں، لیکن بہرحال لگانا ہی پڑتا ہے، اسی طرح اگر عبادات میں مزہ نہ آئے تو چھوڑنا نہیں چاہئے بلکہ اس کو کرتے رہنا ہے۔

لیکن اتنی بات ہے کہ اس کا مزاج ٹھیک نہیں، اس کا کچھ علاج ومعالجہ کرنا چاہئے، پھر ذکر کی حلاوت ایک وقت دل میں اترتی چلی جائے گی، بزرگوں نے کہا کہ آدمی جب گناہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل سے عبادت کی حلاوت کو چھین لیتے ہیں، یہ گناہ کا اثر اوراس کی خرابی ہوتی ہے، معلوم ہوا کہ جن لوگوں کو عبادت میں مزہ نہیں آتا، وہ دراصل گناہوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔

علامہ اقبال نے اسی حقیقت کواس شعر میں بیان کیا ہے:

میں جو سر بسجدہ ہوا کبھی، تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

لہذا آدمی گناہ کو چھوڑے، پھر جا کر نماز پڑھے اوراللہ کو پکارے، اب دیکھو اس سجدہ کی کیا کیفیت ہوتی ہے، گناہ کرکے بھی دیکھ لواور گناہ چھوڑ کے بھی دیکھ لو، فرق خودبخود معلوم ہوجائے گا۔

اللہ کے دوحق ہیں

فرمایا: اللہ کے دوحق ہیں، محبت اور عظمت، محبت اللہ سے رکھنا تو فرض ہے، ساری دنیا کی چیزوں میں سب سے زیادہ محبت اللہ سے ہونی چاہیئے، اسی لئے قرآن کریم میں ایک جگہ اللہ اور رسول کو محبت میں مقدم نہ رکھنے والوں پر وعید آئی ہے:

قُلْ اِنْ كَانَ آبَاءُ كُمْ وَاَبْنَاءُ كُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَاوَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَا اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِي سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ

ترجمہ: آپ فرما دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور کنبہ اور وہ اموال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے نہ چلنے سے تم ڈرتے ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو، تمہیں اللہ اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہوں، تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے)

حکم سے مراد عذاب کا حکم ہے، معلوم ہوا اللہ ورسول کی محبت دنیا و مافیہا سے زیادہ ہونا ضروری ہے، اور اس محبت کا ایک حق ہے اور وہ حق عبادت واطاعت کرنا ہے، کیوں کہ محبوب کی اطاعت کے بغیر محبت کا دعوی بے کار ہے۔

حضرت وراقؒ نے فرمایا ہے کہ:

تَعْصِي الإلٰهَ وَأَنْتَ تُظْهِرُ حُبَّهُ ❁ هٰذَا لَعَمْرِى فِي الْقِيَاسِ بَدِيْعُ

لَوْكَانَ حُبُّکَ صَادِقاً لأَطَعْتَهُ ❁ إنّ: الْمُحِبَّ لِمَنْ يُّحِبُّ مُطِيْعُ

یعنی فرماتے ہیں کہ تو خدا کی نافرمانی کرتا ہے اور اس کے ساتھ اس سے

محبت کا دعوی بھی کرتا ہے، خدا کی قسم یہ تو عجیب ہے، پھر فرماتے ہیں کہ اگر تیرے دعوئ محبت میں کوئی صداقت ہوتی تو تو اپنے خدا کی اطاعت وفرمانبرداری کرتا، کیونکہ اصول یہ ہے کہ کسی کو چاہنے والا اپنے محبوب کا مطیع وفرمانبردار ہوا کرتا ہے۔

لہذا محبت کا حق یہ ہے کہ محبوب کی عبادت واطاعت کی جائے۔ اور اللہ کا دوسرا حق ہے اللہ کی عظمت، قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: '' وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ'' کہ لوگوں نے اللہ کی اس طرح قدر وعظمت نہیں کی جیسی قدر وعظمت کرنا چاہئے، اور فرمایا کہ '' وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْراً ''، یعنی اللہ کی عظمت وبڑائی بیان کرو۔

معلوم ہوا کہ اللہ کی عظمت کرنا اس کا ایک حق ہے اور اس کی عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی گناہوں سے بچ جائے، معصیت سے دور بھاگے، اس کی ناراضگی لانے والی کوئی بات نہ کرے، یہ اللہ کی عظمت وجلالت کا حق ہے اور جس نے معاصی وگناہ نہیں چھوڑے، اس نے اللہ کی عظمت کا حق ادا نہیں کیا، اس لیے اللہ کے دونوں حق ادا کر کے ولی اللہ بن جاؤ، اللہ کا ولی بننے کا یہ نسخہ ہے، اس کو محفوظ کرلو۔

دنیوی عیش میں سکون نہیں

ارشاد فرمایا کہ مزہ اور چیز ہے، دل کا سکون اور چیز ہے، ایک آدمی مزے اڑا رہا ہے، لیکن ضروری نہیں کہ دل کو سکون بھی ہو، شراب بھی ہے، کباب بھی ہے، شباب بھی ہے، مال ودولت اور دنیا کا عیش بھی ہے، لیکن اس کے دل سے پوچھئے کہ سکون بھی حاصل ہے؟ ابھی میں کرنول گیا تھا، وہاں پر میرا قیام ایک گھر میں تھا، جب میرے میزبان اس گھر میں لیکر گئے، تو دیکھتا ہوں کہ اتنا بڑا گھر ہے، بہت لمبا چوڑا ہے، ہر قسم کے راحت وسکون کے اسباب موجود ہیں، خیر اس کے بعد ناشتے کیلئے بہت

لمبا چوڑا دسترخوان بچھایا گیا، ناشتے کے بعد انھوں نے اپنی کہانی سنانی شروع کی، اس کا حاصل یہ تھا کہ گھر کا کوئی آدمی رات بھر نہیں سوتا، دن میں چین نہیں، رات میں نیند نہیں، اپنے حالات اور پریشانی کا انھوں نے مجھ سے ذکر کیا جس کو سن کر بڑا افسوس ہوا کہ دیکھئے اسباب کتنے ہیں، مال کی فراوانی ہے، راحت کے سارے سامان بے تحاشا ہیں، لیکن سکون نصیب نہیں، سامنے یہ حالت اور اندرونی یہ حالت، اسی کو میں نے کہا کہ مزہ اور چیز ہے، دل کا سکون اور چیز ہے، منھ میں کباب ہے، دل میں عذاب ہے، جس نے اللہ کو ناراض کر کے منھ میں کباب رکھ لیا، اللہ کے قہر و عذاب سے اس کے دل کا سکون غارت ہو گیا، اس سے بہتر تو یہ ہے کہ منھ میں سوکھی روٹی ہو اور دل میں سکون ہو، یاد رکھو! گناہوں سے سکون نہیں مل سکتا، ہاں تھوڑی دیر کے لیے مزہ مل سکتا ہے، اسی لیے لوگ کہتے ہیں کہ ہم تھوڑی دیر کے لئے مزہ اڑا لیں گے، کیوں کہ وہ بھی جانتے ہیں کہ گناہوں کا مزہ صرف تھوڑی دیر کے لئے ہوتا ہے، لیکن ایک دولت اللہ کے قرب کی ہے کہ جس کو مل جاتی ہے وہ سوتا ہوا بھی چین پاتا ہے اور جاگتا ہوا بھی، بیماری میں بھی اور صحت میں بھی، اس لئے انسان کو اللہ کے قرب اور محبت کی تلاش میں لگ جانا چاہئے، اسی میں قلب کا سکون ہے۔

ایک طالب علم کا تقویٰ

ایک طالب علم کا قصہ سناتا ہوں، ایک جگہ پر ایک مسجد میں ایک طالب علم رہتا تھا، اس علاقہ میں کوئی حادثہ ہو گیا، رات کا وقت تھا، تو ایک عورت اس مسجد میں گھس آئی، وہاں اس عورت نے دیکھا کہ ایک نوجوان مولوی صاحب ایک کونے میں مطالعہ میں مصروف ہیں، اس عورت نے آکر ان سے کہا کہ حالات باہر بہت

خراب ہیں، امن وامان نہیں ہے، اب میں اپنے مقام پر جا نہیں سکتی، اس لئے اب میں یہاں رات گذارنے آئی ہوں، اس لئے رات یہاں گزارنے کی اجازت دیجئے ۔اب وہ کیسے انکار کرسکتے تھے، اجازت دے دی، اب وہ عورت ادھر کو بیٹھ گئی، دوسری طرف یہ مولانا مطالعہ میں مصروف ہوگئے اوران کے سامنے ایک چراغ جل رہا تھا، وہ طالب علم درمیانِ مطالعہ اپنی انگلی کو چراغ میں داخل کرتے اور نکالتے ، پھر کچھ دیر مطالعہ کرتے ،اور پھر اپنی انگلی کو چراغ میں داخل کرتے اور نکالتے ، دوسری طرف یہ عورت اس منظر کو دیکھ رہی تھی ، کہ کہیں پاگل تو نہیں ہوگیا کہ اپنے آپ کو جلارہاہے، آخر کیا قصہ ہے؟ یہاں تک کہ رات ختم ہوکر جب صبح ہوئی،تو وہ طالب علم مسجد کے باہر گئے ،حالات کا مشاہدہ کرکے آئے ،اوراس عورت سے کہا کہ اب نماز کا وقت ہونے والا ہے، نمازی آنے والے ہیں،اس طرح اب تمہارا یہاں رہنا مناسب نہیں کہ لوگوں میں بدگمانی ہوگی، اب باہر کا راستہ صاف ہوگیا ہے،آؤتم کو باہر تک چھوڑ آؤں ،اس نے کہا جب راستہ صاف ہےتو جانے میں کوئی حرج نہیں لیکن جانے سے پہلے ایک سوال کا جواب چاہتی ہوں،سوال یہ کہ رات بھرآپ اپنی انگلی کوجلانے کی کوشش کیوں کرتے رہے،اس راز کو جب آپ بتائیں گے،تب میں یہاں سے جاؤں گی ،انھوں نے کہا کہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے،اس نے کہا جب تک آپ اس راز کونہیں بتائیں گے، میں یہاں سے جانے کی نہیں ،انھوں نے کہا کہ بات دراصل یہ کہ تم جب یہاں آئیں تو میرے دل میں نفسانی خواہشات ابھرنے لگے،اور مجھے بے چین کرنے لگے، میں نے فوراًاپنے دل کو کہا کہ اگرتو برا کام کرے گا،تو تجھے جہنم میں جلنا پڑے گا،اس سے پہلے دنیا کی آگ کا مزہ چکھ لے، میں اسے دنیا کی آگ کا مزہ چکھارہا تھا اوراپنے نفس کو کہہ رہا تھا کہ اگر تجھ میں اس کو برداشت

کرنے کی طاقت ہو،تو پھرآگے دیکھا جائے گا،غرض جب بھی میرانفس گناہ کا تقاضا کرتا،تومیں اپنےنفس کوآگ کامزہ چکھاتا تھا،اس طرح پوری رات گذری۔

طلباءکرام غورکریں کہ یہ ہےتقوی کی زندگی،اس طرح اپنے آپ کولذات اورخواہشات سے بچاناچاہیئے۔

ظاہرباطن کاترجمان ہوتا ہے

میرے طالب علمی کے زمانے میں تھانہ بھون میں ایک بزرگ تھے، ہم لوگ جلال آباد سے تھانہ بھون ان بزرگ سے ملنے جایا کرتے تھے،ان کا نام حضرت مولاناظہورالحسن صاحب تھا،حضرت تھانوی کی خانقاہ میں وہ رہتے تھے،اب ان کے صاحبزادے مولانانجم الحسن صاحب رہتے ہیں،تو کبھی کبھی فرصت ہوتی تو ان کی خدمت میں جایا کرتے تھے،ان کے چہرہ کودیکھ کرایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک نور ہے، جوٹپک رہا ہے، چاہیں تو پکڑ لیں،اوریہی کیفیت تھی حضرت مسیح الامت نوراللہ مرقدہ کی،دیکھنے میں معلوم ہوتا تھا کہ واقعی نورٹپک رہا ہے،کوئی چیز لے جاؤاورپکڑلو،یہ اللہ والےاپنے باطن کو ہمیشہ گندگیوں سے صاف رکھتے ہیں،جس کی نورانیت چہرہ سے معلوم ہوجاتی ہےاوراسی طرح کوئی چھپ کرگناہ کرکےآتا ہےتواس کے چہرہ کی بے رونقی سےاس کےدل کی ترجمانی ہوجاتی ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی فراست

ایک دفعہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے،حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سےایک بازارمیں ایک گناہ ہوگیا کہ نامحرم عورت پرنگاہ پڑگئی، پھروہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آئےاوران کی مجلس میں بیٹھ گئے،حضرت رضی اللہ عنہ نےفرمایا کہ کیاحال

ہے کہ بعض لوگوں کی آنکھوں میں زنا کا اثر ہوتا ہے اور وہ مجلس میں آ کر بیٹھ جاتے ہیں، حضرت انس کہنے لگے کہ حضرت! کیا جبرئیل اب بھی وحی لاتے ہیں؟ کیا نبوت ختم نہیں ہوئی؟ جبرئیل کی آمد و رفت کیا اب بھی باقی ہے؟ حضرت عثمان غنیؓ نے فرمایا نہیں، نبوت کا دروازہ تو بند ہو گیا، مگر فراست کا دروازہ ابھی کھلا ہوا ہے، مومن کی فراست دیکھ لیتی ہے کہ کس نے کیا گناہ کیا ہے۔ (تفسیر القرطبی: ۱۰/۴۴)

حضرت شاہ ابرار الحقؒ کا ایک ارشاد

ایک بزرگ مدرسہ آئے تھے، انھوں نے ہمارے مرشد حضرت شاہ ابرار الحق صاحبؒ کی ایک بات بتائی کہ جن چیزوں سے نقصان ہوتا ہے، ان چیزوں سے جانور بھی بچتا ہے، مثلاً راستہ میں اگر کوئی کتا یا بلی اور کوئی جانور بیٹھا ہوا ہو، اور اگر گاڑی یا موٹر کار آ جائے، تو وہ فوراً اٹھ کر وہاں سے چلا جاتا ہے، کیوں کہ اسے یہ معلوم ہے کہ اگر یوں ہی بیٹھا رہا تو اسے نقصان ہو سکتا ہے۔ لہذا تو فرمایا کہ جب جانور اپنی ذات کو نقصان سے بچاتا ہے تو کیا ایک مسلمان کو اپنے دین کی حفاظت کی خاطر گناہوں سے بچنا نہیں چاہئے؟ دین کی حفاظت کے لئے تو اس سے زیادہ بچنا چاہئے، تا کہ ایمان ضائع نہ ہو جائے، اور اس کے لئے بہت اہتمام سے اپنے آپ کو گناہوں سے بچانے کی پوری پوری کوشش کرنا چاہئے۔

نفس کی اصلاح، ایک بزرگ کا قصہ

دہلی کی جامع مسجد میں ایک مرتبہ ایک بزرگ فجر کی نماز کے بعد سیڑھیوں پر بیٹھ گئے اور یہ کہنے لگے کہ ''تو میرا خدا نہیں، میں تیرا بندہ نہیں، پھر میں تیری کیوں مانوں؟

دیکھنے والے لوگ کہنے لگے یہ کافر ہو گئے، کسی نے کہا پاگل ہو گئے، جب نماز کا وقت آتا تو یہ بزرگ اندر جا کر نماز پڑھتے اور باہر آ کر بیٹھ جاتے، اور پھر یہی بات کہنے لگتے، مغرب کے قریب ایک شخص وہاں سے گذرتا ہوا ان کی بات سنا اور کھڑا ہو گیا، اور پوچھا کہ حضرت! یہ ''تو'' کا مخاطب کون ہے، اور یہ بات آپ کس سے کہہ رہے ہیں؟ اس پر ان بزرگ کو ہنسی آ گئی، اور کہنے لگے ''دہلی جیسے شہر میں ایک ہی عقلمند نظر آیا، کسی نے مجھے پوچھا ہی نہیں کہ میرے اس ''تو'' کا مخاطب کون ہے، اور میں کس سے یہ کہہ رہا ہوں، خود ہی سمجھ لیا کہ میں اپنے اللہ سے یہ بات کہہ رہا ہوں، حالانکہ میں اللہ سے نہیں کہہ رہا ہوں، پھر اس شخص سے کہنے لگے ''تو نے بڑی عقلمندی کا کام کیا کہ مجھ سے پوچھ لیا، دراصل میرا مخاطب میرا نفس ہے اور میں نفس سے مخاطب ہوں کہ اے نفس تو میرا خدا نہیں ہے، میں تیرا بندہ اور غلام نہیں ہوں، اس لئے میں تیری کیوں مانوں؟ میں تو خدا کی مانوں گا۔

اس نے کہا کہ یہ بات آپ کیوں فرما رہے تھے؟ اس پر ان بزرگ نے کہا: بات یہ ہے کہ آج فجر کی نماز پڑھنے کے بعد مسجد سے نکل رہا تھا، تو نفس نے شدت سے تقاضا کیا کہ آج ناشتہ میں حلوے پراٹھے کھلاؤ، تو میں نے اس سے کہنا شروع کر دیا کہ تو میرا خدا نہیں ہے، اور میں تیرا بندہ نہیں ہوں، اس لئے میں تیری کیوں مانوں؟ میں تو میرے اللہ کی مانوں گا، اور جب بھی وہ مجھ سے یہ مطالبہ کرتا ہے، میں یہی جواب دیتا ہوں

یہ واقعہ بڑا عبرت انگیز ہے اور اصلاح نفس کی فکر کرنے والوں کو ایک عمدہ سبق فراہم کرتا ہے، بزرگان دین کہتے ہیں کہ ناجائز چیزوں میں بالکلیہ پرہیز کرنا چاہئے اور جو جائز چیزیں ہوں، مثلاً کھانے پینے کی حلال چیزیں، ان میں پابندی نہیں ہے، لیکن ان

میں تقلیل اور کمی کرنا چاہئے ، کہ کبھی نفس کو دیدو، کبھی کہدو کہ بھائی !اب نہیں تب ملے گا، اس سے نفس کنٹرول میں رہے گا، اگراس کی ہر جائز وحلال خواہش پوری کی گئی تو وہ سر پر بیٹھ جائے گا۔

نفس کی چالیں

حضرت حکیم اختر صاحب دامت برکاتہم نے ارشاد فرمایا کہ نفس حسینوں سے نظر ملاتا ہے، کبھی شانِ رحمت سے، اور کبھی شان غضب سے، مثلاً کوئی لڑکی مسکین ویتیم ہو، اور وہ رورہی ہے تو جناب بھی رورہے ہیں، اشکبار آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، بصورت رحمت یہ بدنظری کا لعنتی کام کررہا ہے، اسی طرح کبھی غصہ میں بدنظری کا لعنتی کام کرتا ہے، مثلاً ہوائی جہاز میں ائر ہوسٹس سے جوس مانگا، لانے میں دیر کردی، یا کھانا اچھا نہیں ہے، ڈانٹ رہا ہے، غصہ سے آنکھیں بھی سرخ ہیں، مگر اسے دیکھ بھی رہا ہے، تو یہ غصہ میں بدنظری کررہا ہے، اللہ سب کی حفاظت فرمائے، غصہ کررہا ہے مگر بدنظری سے اندر اندر مزے لے رہا ہے، نفس سے ہوشیار رہئے ، اس کی چالوں میں نہ آیئے، نفس کی چالوں سے وہی بچ سکتا ہے، جس پر اللہ کی رحمت کا سایہ ہو، اس لئے اللہ کی رحمت مانگتے رہنا چاہئے ، اور گناہ سے بچنے کا پورا پورا اہتمام ہو، اللہ ہم سب کو گناہوں سے بچنے کی توفیق نصیب فرمائے۔

حضرت جنید بغدادیؒ کی فراست

حضرت جنید بغدادیؒ کے زمانے میں ایک واقعہ پیش آیا، وہ یہ کہ ایک عیسائی اپنے مذہب کا بہت بڑا عالم تھا، اس نے کہیں یہ حدیث پڑھ لی " اِتَّقُوْا فَرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ " کہ مومن کی فراست سے ڈرتے رہو، اس لئے کہ

وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ (ترمذی: ۳۰۵۲، طبرانی فی الاوسط: ۳۱۲/۳)

تو یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی کہ سب تو آنکھ سے دیکھتے ہیں مومن فراست سے کیسے دیکھتا ہے؟ اور کیسے سمجھ میں آئے گی کہ فراست کیا چیز ہوتی ہے، بعض چیزیں سمجھانے سے سمجھ میں نہیں آتیں، جب تک کہ خود پر نہیں گذرتیں، بس وہاں پر یا تو تقلید کرے اور مان جائے کہ ہاں بھائی ہوتا ہے، یا نہیں تو خود کو حاصل ہو تو وہ بات تو سمجھ میں آجائے، الغرض اس کو اس حدیث کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا، اس نے علماء سے پوچھا کہ اس حدیث کا کیا مطلب ہے؟ اس کو سمجھایا گیا مگر اس کی سمجھ میں پھر بھی نہیں آیا، تو اس کو کسی نے مشورہ دیا کہ جنید بغدادی کے پاس چلا جا، وہ تجھکو سمجھا دیں گے، چنانچہ وہ مسلمانوں جیسا لباس پہن کر جنید بغدادی کے پاس گیا اور جا کر کہا: السلام علیکم، حضرت نے کہا: هَدَاكَ اللہ، (اللہ تجھ کو ہدایت دے) اب بس وہیں پر ٹھٹک گیا کہ میں سلام کرتا ہوں تو سب لوگ سلام کے جواب میں " وعلیکم السلام " کہتے ہیں اور یہ حضرت "ھداک اللہ" کہہ رہے ہیں، اس نے کہا کہ حضرت میں نے سلام کیا آپ نے " ھداک اللہ " کہا، سلام کا جواب نہیں دیا، کیا بات ہے؟ حضرت نے کہا کہ (اتقو فراسة المومن فانه ينظر بنور الله)، مومن کی فراست سے بچو اس لئے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے، اور کہا کہ تو تو عیسائی ہے، اور مسلمانوں جیسا لباس پہن کر آیا ہے، یہی ہے فراست جس سے میں تجھے دیکھ رہا ہوں، اب اس کی سمجھ میں آیا کہ واقعی ایسا ہوتا ہے۔

نفس کی اصلاح اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کا طریقہ

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کر بارے میں بزرگوں سے سنا ہے کہ جب

ان کا نفس کسی چیز کا تقاضا کرتا تو کہتے کہ دو رکعت نماز پڑھ لینا، پھر چائے پی لینا، اس طرح نفس کو جو وہ چاہتا دیتے نہیں تھے، تا کہ نفس ان کے کنٹرول میں رہے، اس طرح نہیں کیا گیا تو پھر وہ ہمارے اوپر سوار ہوجائے گا۔

حضرت رشید احمد گنگوہیؒ کا طریقۂ اصلاح

حضرت رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں ایک آدمی آیا اور بیعت کی درخواست کی، تو حضرت نے اُس کو بیعت کے بعد گناہوں سے توبہ کرائی کہ زنا نہیں کروں گا، چوری نہیں کروں گا، نماز کی پابندی کروں گا وغیرہ، جب بیعت ہوگئی، تو اس نے کہا: حضرت سب چیزوں سے آپ نے توبہ کرادی، مگر افیون سے توبہ نہیں کرائی، حضرت نے کہا: مجھے کیا خبر کہ تم افیون کھاتے ہو، پھر حضرت نے افیون سے بھی توبہ کرادی، پھر حضرت نے اس سے پوچھا کہ دن میں کتنی افیون کھاتے ہو؟ چونکہ حضرت کی عمر کا اخیر زمانہ تھا، نابینا ہو چکے تھے، نظر نہیں آتا تھا، اس لئے اس سے فرمایا کہ میرے ہاتھ پر رکھدو کہ اس کی مقدار معلوم ہوجائے، جب اس نے ایک مقدار آپ کے ہاتھ پر رکھی، تو حضرت نے فرمایا کہ اب اس کی آدھی اتنی کھالینا، یہ اس لئے فرمایا تا کہ نفس بعد میں مشکل میں نہ پڑ جائے، اور لینے کے دینے نہ پڑ جائیں، مگر وہ آدمی بڑا باہمت تھا، اس نے کہا کہ حضرت جب توبہ کرلی، تو اتنی اور اتنی کیا، میں نے سب سے توبہ کرلی، چنانچہ بالکل چھوڑ دیا، ایسے بھی اللہ کے بندے ہوتے ہیں۔

اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شیخ کو اصلاح میں کن کن باتوں کی لحاظ رکھنا پڑتا ہے؟

مولانا روم کی کایا کب پلٹی؟

پیر شمس تبریزیؒ جو حضرت مولانا جلال الدین رومی کے شیخ تھے، اپنے

زمانے کے بہت بڑے اولیاء اللہ میں ان کا شمار ہوتا تھا، بڑے صاحب کرامت بزرگ تھے، ان کی ایک کرامت یہ لکھی ہے کہ کبھی کبھی مچھلی کھالیا کرتے تھے، اور مچھلی پکڑتے اور سورج کے قریب اپنا ہاتھ لے جاتے اور وہ مچھلی سورج کی تپش سے بھنی جاتی اور اس کو کھالیا کرتے، اتنے بڑے صاحب کرامت بزرگ، لیکن ان کی پوری زندگی اس طرح گذری کہ وہ تو اللہ اللہ کرتے رہتے اور لوگ جو ان کو بزرگ مانتے تھے، وہ اس لئے ان کے پاس آتے تھے کہ حضرت! ہمارے لئے دعا کر دیجئے، فلاں مقدمہ چل رہا ہے، تجارت ٹھپ ہوگئی ہے وغیرہ وغیرہ، یعنی صرف دنیا کے لئے آتے، حتی کہ حضرت کی عمر کا آخری زمانہ آ گیا، ایک دن بیٹھ کر آہ کرنے لگے اور کہنے لگے، اے اللہ میرے سینے میں تیرے عشق کی جو آگ بھڑک رہی ہے، کوئی بندہ اسے لینے آج تک میرے پاس آیا نہیں، ایک عجیب جذبہ کے ساتھ تڑپ کر کہا اور کہا: اے اللہ میرے دنیا سے جانے کا وقت شاید قریب آرہا ہے، اس سے قبل کہ میں دنیا سے جاؤں، کسی ایک کو تو میں تیری یہ محبت دے کر جاؤں، اس کا کوئی انتظام فرما، اللہ نے دعا قبول کی، اس کے بعد وہ ایک مرتبہ دریائے دجلہ کے کنارے ٹہلتے ہوئے جارہے تھے، اللہ کے ذکر میں زبان لبریز تھی۔

چلتے چلتے جب دوسرے کنارے پر دیکھا تو مولانا روم ٹہلنے کے لئے آئے ہوئے ہیں، ادھر انھوں نے ان کو دیکھا اور ادھر انکو انھوں نے دیکھا، دل دل میں یہ کہا کہ اگر یہ بندہ مجھے مل جائے تو اس بندہ کے دل میں اللہ کی محبت کی آگ منتقل کر دوں، اللہ نے فوراً دعا قبول کی، وہیں سے مولانا روم کے دل میں یہ بات آ گئی کہ ایک اللہ کا ولی یہاں آیا ہوا ہے، اس کی خدمت میں جا کر کچھ فیض حاصل کرنا چاہئے، انھوں نے دوسرے کنارے سے اس کنارے آ کر فیض حاصل کرنا چاہا، مولانا روم اس زمانے

کے بہت بڑے عالم تھے،اور وہ اس زمانے کے بادشاہ کے نواسے تھے،مولانا روم خوارزم مملکت کے بادشاہ کے نواسے ہوتے ہیں، جب وہ باہر نکلتے تھے،تو ان کے ساتھ ایک لشکر ہوتا تھا، بڑی شان وشوکت کے ساتھ سوار ہوکر نکلتے تھے، بڑے بڑے علماء ان کی رکاب پکڑ کر چلتے تھے،اوراس زمانے میں انھوں نے اپنے علم کا لوہا منوالیا، ہزاروں مناظرے ومباحثے کئے، بڑی بڑی تقریریں کی،علم کی دنیا میں ان کا نام ایک روشن ستارہ کے مانند مانا جاتا تھا،اب یہ ہوا کہ وہ اللہ کا بندہ اللہ کے عشق کی آگ لینے کے لئے ایک کنارہ سے دوسرے کنارے آیا اور بیعت ہوگیا،مولانا روم کہتے ہیں، جب تک شمس تبریزی کے ہاتھ پر میں نے بیعت نہیں کی اور جب تک ان کی جوتیاں سیدھی نہیں کی، مجھے علم کا چسکہ بھی نہیں معلوم ہوا،آج مجھے معلوم ہوا کہ علم کیا ہوتا ہے؟ اللہ کے عشق اوراس کی معرفت کے بغیر سب کچھ یوں ہی بیکار ضائع ہوتا ہے،نماز روزہ ودیگر عبادات میں وہ لذت نہیں ملتی، جوان چیزوں سے حاصل ہوتی ہے، مولانا روم کی طبیعت اسی وقت بدلنی شروع ہوگئی، مولانا روم نے مثنوی شریف لکھی،ان کی کوئی کتاب مثنوی کے علاوہ دنیا میں مشہور نہیں ہے، حالانکہ ان کی اور بہت ساری کتابیں ہیں مگر اللہ نے مثنوی کو جو مقام دیا وہ کسی اور کتاب کو نہیں دیا ،حتی کہ بعض علماء کہتے ہیں کہ یوں سمجھو کہ یہ مثنوی درحقیقت فارسی کا قرآن ہے، قرآن کے تمام علوم واسرار، معارف ودقائق کواس کے اندر کھول کھول کر بیان کردیا ہے، اتنا عظیم علم جوان کو اللہ نے دیا ، یہ دراصل شمس تبریزی کی برکت تھی ،ان کی جوتیوں کوسیدھا کرنے کا نتیجہ تھا، بتانا یہ چاہتا ہوں کہ دنیا والے دنیا مانگتے ہیں ،لیکن اللہ والے، اللہ سے اللہ ہی کو مانگتے ہیں ،مولانا روم نے اللہ مانگ لیا، جب اللہ مل گیا

توان کی حالت تبدیل ہوگئی۔

آپ متقی کیسے بن سکیں گے

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے سامنے عورتیں آتی ہیں، ہم کیا کریں؟ ہمارے سامنے برائی آتی ہے، ہم کیا کریں؟ میں کہتا ہوں کہ اگر برائی نہ آئے تو آپ متقی کیسے بن سکیں گے، اگر کوئی برائی نہ آنی ہوتی، تو پھر آپ جنت میں بیٹھے ہوتے، اور کوئی جنتی متقی نہیں، ہاں ہر متقی جنتی ہے، جنت کا رہنے والا متقی نہیں ہوسکتا کیونکہ جنت میں متقی بننے کے اسباب ہی نہیں ہیں، ہاں جو دنیا میں رہ کر متقی بنا، وہ ضرور جنتی ہوگا، اسی لئے اللہ تعالے نے حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں بھیجا، اگر وہ جنت میں رہتے تو متقی نہیں بن سکتے تھے، اللہ نے ان کو جنت سے نکالکر دنیا میں بھیجا کہ جاؤ، دنیا میں مصائب و پریشانیاں آئیں گی، کوئی کانٹا دل میں، کوئی کانٹا ہاتھ پر، کوئی پیر میں لگے گا، ان تمام کانٹوں سے بچ کر زندگی گذارنے کا نام تقوی ہے، جو آدمی یہ تقوی کی زندگی گذارے گا، وہ جنتی ہوگا، اگر کوئی اندھا یہ کہے کہ میں نے کبھی کسی عورت کو دیکھا ہی نہیں، تو اس میں اندھے کا کیا کمال ہے؟ اس لئے کہ وہ تو مفقود البصر ہے، دیکھنا چاہے تب بھی نہیں دیکھ سکتا، ہاں، کوئی بینا یہ کہے کہ میں نے کبھی غلط نگاہ نہیں ڈالی، کسی عورت کو نہیں دیکھا، تو یہ کمال ہوگا، جیسے فرشتوں کا گناہوں سے بچنا کمال نہیں، کیونکہ ان میں گناہ کرنے کی صلاحیت ہی نہیں، معلوم ہوا کہ گناہ کی صلاحیت ہونے کے باوجود جو بچ جائے وہ قابل مدح ہے۔

نفس کی اصلاح، اعتدال کے ساتھ ہونی چاہیے

ایک دم نفس پر کنٹرول نہیں کرنا چاہئے، بلکہ اس کو شیخ کی رائے سے روک

تھام کرنا چاہئے، ورنہ نتائج اچھے نہیں نکلتے، اس پر ایک لطیفہ یاد آ گیا، ایک آدمی کے پاس ایک گھوڑا تھا، اس کا مالک جب اس کو سفر میں لیکر نکلتا، تو اس کی ایک بری عادت یہ تھی کہ لید کرنے کے بعد، گھوم کر اس کی بد بو سونگھتا اور پھر آگے بڑھتا، یہ شخص اس کی اس حرکت سے بہت تنگ تھا، ایک دن اس آدمی کو کسی سفر پر جانا تھا، اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر سفر پر نکلا، راستہ میں اس گھوڑے نے اپنی وہی حرکت شروع کر دی، مالک کو بڑی پریشانی ہونے لگی، لمبا سفر تھا، اس طرح یہ کرے گا تو پریشانی ہوگی، چلتے چلتے راستہ میں ایک اور گھوڑ سوار سے ملاقات ہوگئی، دونوں باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے، ایک جگہ اس گھوڑے نے وہی پرانی حرکت کی، تو دوسرے گھوڑے والے نے پوچھا کہ یہ کیا قصہ ہے تمہارے گھوڑے کا؟ کہا کہ میرے گھوڑے میں یہ عادت پیدا ہوگئی ہے، جس سے میں بہت پریشان ہوں، اس نے کہا کہ اس گھوڑے کا علاج میں کرتا ہوں، آپ میرے گھوڑے پر سوار ہو جایئے اور اپنا گھوڑا مجھے دیدیجئے، چنانچہ ادل بدل کر کے سفر شروع کر دیا، جب وہ دوبارہ راستہ میں لید کر کے اپنی پرانی حرکت کرنے لگا، تو اس آدمی نے گھوڑے کی اس قدر پٹائی کی کہ گھوڑے کو بھی عقل آ گئی، ایک ہی دفعہ کی پٹائی میں ٹھیک ہوگیا، بہت دور سفر کرنے کے بعد دونوں کی راہ الگ ہو رہی تھی، پھر دونوں نے اپنا اپنا گھوڑا بدل لیا، اور اس دوسرے شخص نے کہا کہ بھائی! اب تمہارا گھوڑا ٹھیک ہوگیا، لیکر جاؤ، یہ کہکر وہ آدمی چلا گیا، دونوں کا راستہ الگ ہوگیا، اور کچھ دیر گزر گئی، جب اس گھوڑے کو خوب یقین ہوگیا کہ وہ دوسرا گھوڑ سوار ہم سے دور چلا، تو وہ گھوڑا وہاں سے مڑا اور پورا راستہ جہاں جہاں لید کیا تھا وہاں وہاں واپس جا کر، ہر جگہ سونگھ آیا۔

اس میں عبرت ہے کہ نفس کو کنٹرول کرنے کے لئے اعتدال کی ضرورت

ہے، اگرایک دم سیدھا کر دیا جائے، تو فی الوقت تو وہ سدھر جائے گا، مگر جب دوبارہ لوٹے گا، تو ایسا لوٹے گا کہ کفر کی طرف بھی جا سکتا ہے، اللہ حفاظت فرمائے۔

تقویٰ کسے کہتے ہیں؟

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ بتاو، تقوی کسے کہتے ہیں؟ تو انہوں نے عرض کیا کہ امیر المومنین! کیا آپ کا گذر کبھی ایسے راستہ سے ہوا ہے؟ جو تنگ ہو، ادھر اُدھر کانٹے دار جھاڑیاں ہوں، چلنا دشوار ہو؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں ایسی جگہ سے گزر رہوا ہے، تو انہوں نے پوچھا کہ آپ جب اس راستہ پر سے گزرے تھے تو کیسے گزرے تھے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں اس طرح گزرا تھا کہ اپنا دامن سمیٹ لیا تھا، اپنے آپ کو بچا کر بہت ہی احتیاط سے گزرا تھا، تو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: بس اسی کا نام تقوی ہے، کیونکہ دنیا بھی کانٹوں بھرا راستہ ہے، کہیں بدنظری کے مواقع ہیں، تو کہیں کانوں سے گانوں کی آواز ٹکرا رہی ہے، کہیں کفر کے کانٹے ہیں، کہیں شرک ونفاق کے کانٹے ہیں، یہ سب روحانی کانٹے ہیں، ان سب سے بچ کر چلنے کا نام تقوی ہے۔

(تفسیر ابن کثیر: ۱/۱/۴۱، قرطبی:)

اسی مفہوم کو عربی شاعر ابن المعتز نے اشعار میں یوں بیان کیا ہے:

خلِّ الذنوب کبیرھا و صغیرھا فھو التقٰی

چھوٹے بڑے سب گناہ چھوڑ دو، یہی تقویٰ ہے۔

واصنع کماشٍ فوق ارضِ الشوک یحذر مایرٰی

اور کانٹوں دار زمین پر چلنے والے کی طرح ہر اس چیز سے احتیاط کرو جو نظر پڑے۔

لا تحقرن صغیرۃ ان الجبال من الحصٰی

چھوٹے گناہ کو بھی حقیر نہ سمجھو، کیونکہ پہاڑ چھوٹی چھوٹی کنکریوں ہی سے بنتا ہے۔

سب سے بڑی چیز اللہ کی معرفت ہے، ایک عجیب قصہ

مولانا رومی نے سلطان محمود غزنوی کا ایک عجیب واقعہ لکھا ہے جو بڑا عبرت خیز و سبق آموز ہے، وہ یہ کہ سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں چوروں کا کچھ زور ہو گیا تھا، اور بادشاہ اس کی وجہ سے پریشان ہوا، اور چوروں کو پکڑنے کے لئے ایک عجیب تدبیر نکالی کہ شاہی لباس اُتار کر چوروں کا سا پھٹا پرانا لباس پہن لیا، اور شہر میں گشت کرنے لگا، ایک جگہ پر دیکھا کہ بہت سے چور اکٹھے بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے ہیں، بادشاہ بھی ان میں بیٹھ گیا، چوروں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ بادشاہ نے کہا کہ میں بھی تم جیسا ہوں، چوروں نے سمجھا کہ یہ بھی کوئی چور ہے، انھوں نے کہا کہ تم اپنا کوئی ہنر بتاؤ، اگر تمہارے اندر کوئی ہنر ہوگا، تو تم کو اپنے ساتھ شریک کرلیں گے، ورنہ نہیں، بادشاہ نے کہا: پہلے آپ لوگ اپنا اپنا ہنر بتاؤ، پھر میں اپنا ہنر بتاؤں گا، ایک چور نے کہا کہ میں اونچی سے اونچی دیوار پھاند کر مکان میں داخل ہو جاتا ہوں، اگرچہ بادشاہ کا قلعہ کیوں ہو، دوسرے نے کہا کہ میری ناک کی یہ خاصیت ہے کہ میرا ہنر یہ ہے کہ کسی جگہ کا مٹی سونگھ کر بتا دیتا ہوں کہ یہاں خزانہ ہے یا نہیں؟ تیسرے چور نے کہا کہ میرے بازو میں اتنی طاقت ہے کہ میں گھر میں گھسنے کے لئے اس میں سوراخ کرسکتا ہوں، چوتھے چور نے کہا کہ میں ماہر حساب ہوں، Phd کیا ہوا ہوں، کتنا ہی بڑا خزانہ کیوں نہ ہو، چند لمحوں میں حساب لگا کر تقسیم کر دیتا ہوں، پانچویں چور نے کہا کہ میرے کانوں میں ایسی خاصیت ہے کہ میں کتے کی آواز سن کر بتا دیتا ہوں کہ کتا کیا کہہ رہا ہے، چھٹے چور نے کہا کہ میری آنکھ میں یہ خاصیت ہے کہ

جس چیز کو رات میں دیکھ لیتا ہوں، دن میں اس کو پہچان لیتا ہوں، اب بادشاہ نے کہا کہ میری داڑھی میں یہ خاصیت ہے کہ جب مجرمین کو پھانسی کے لئے جلاد کے حوالے کیا جاتا ہے، اس وقت اگر میری داڑھی ہل جاتی ہے تو مجرمین پھانسی کے پھندے سے بچ جاتے ہیں، چونکہ وہ بادشاہ تھا، اس نے ایک خاص لطیف انداز سے اپنا ہنر اور کمال بیان کیا، سارے چور یہ بات سن کر خوش ہو گئے، اور کہنے لگے کہ آپ تو چوروں کے قطب ہیں، جب ہم کسی مصیبت میں پھنس جائیں گے، تو آپ ہی کے ذریعہ ہم کو خلاصی مل سکتی ہے۔

پھر سب نے مشورہ کیا اور طے کیا کہ آج بادشاہ کے یہاں چوری کی جائے، اس لئے کہ آج مصیبت سے چھڑانے کے لئے، داڑھی والا بھی موجود ہے، لھذا سب کے سب بادشاہ کے محل کی طرف چل پڑے، راستہ میں کتا بھونکا، تو کتے کی آواز پہچاننے والے نے کہا کہ کتا کہہ رہا ہے کہ بادشاہ تمہارے ساتھ ہے، لیکن چور پھر بھی چوری کے ارادے سے باز نہ آئے، اور بادشاہ کے یہاں چوری کر ڈالی، اور خزانہ لوٹ لیا، اور جنگل کی طرف آئے اور وہاں بیٹھ کر ماہر حساب نے حساب لگا کر چند منٹوں میں سب کو تقسیم کر دیا، بادشاہ نے کہا: سب لوگ اپنا پتہ لکھوا دو، تا کہ آئندہ چوری کرنا ہو تو ہم سب لوگ آسانی سے جمع ہو سکیں، سب کا پتہ نوٹ کر لیا گیا، اور سب نے اپنا اپنا راستہ لیا، اگلے دن بادشاہ نے عدالت لگوائی اور پولس کو حکم دیا کہ سب کو پکڑ کر لاؤ، جب سب چور ہتھکڑیاں ڈالکر حاضر کئے گئے، بادشاہ نے سب کو پھانسی کا حکم دے دیا، اور کہا کہ اس مقدمہ میں کسی گواہ کی ضرورت نہیں، کیونکہ سلطان خود وہاں موجود تھا۔

یہاں ایک بات ضمناً عرض کرتا ہوں کہ اسی طرح قیامت کے دن اللہ کو کسی

گواہ کی ضرورت نہیں ہوگی، اس لئے کہ: وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ (تم جہاں بھی ہو، وہ تمہارے ساتھ ہے) اگر تم دو ہو تو تیسرا خدا ہے، چار ہو تو پانچواں خدا ہے، جب تم بدکاریاں کرتے ہو، تو اللہ سب دیکھتا ہے، اللہ کو کسی گواہ کی ضرورت نہیں، اس کے باوجود قیامت کے دن بندوں پر اتمام حجت کرنے کے لئے ہاتھوں اور پیروں کی، فرشتوں کی اور صحیفۂ اعمال کی گواہی ہوگی۔

الغرض جب چھ کے چھ چور پھانسی کے تختہ پر کھڑے ہوگئے، تو وہ چور جو آنکھوں کی خاصیت والا تھا، اس نے بادشاہ پہچان لیا کہ یہ وہی شخص ہے، جو رات ہمارے ساتھ تھا، وہ تختہ دار سے چلاّیا کہ حضور کچھ دیر کے لئے امان دی جائے، اور آپ سے تنہائی کا موقعہ دیا جائے، بادشاہ نے کہا ٹھیک ہے، تھوڑی دیر کے لئے پھانسی کو موقوف کر دو، اور اس کو میرے پاس بھیج دو، اس نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ ہر یکے خاصیت خود را نمود، ہر ایک نے اپنی خاصیت بتا دی، ہر ایک نے اپنا ہنر بتا دیا، ہمارے وہ ہنر جن پر ہم کو ناز تھا، انھوں نے ہماری بدبختی کو اور بڑھایا کہ آج ہم تختہ دار پر ہیں، اے بادشاہ! میں نے آپ کو پہچان لیا ہے کہ آپ نے وعدہ فرمایا تھا، جب مجرموں کو تختہ دار پر چڑھایا جاتا ہے، اگر اس وقت میری داڑھی ہل جاتی ہے تو مجرمین پھانسی سے نجات پا جاتے ہیں، لہذا آپ اپنے ہنر کو ظاہر فرمائیں، تاکہ ہماری جان خلاصی پائے، سلطان محمود نے کہا: ''تمہارے ہنروں نے تو تمہیں مبتلائے قہر کر دیا ہے، لیکن یہ شخص جو سلطان کا عارف ہے، اس کی چشمِ سلطان شناس کے طفیل میں تم سب کو رِہا کیا جاتا ہے۔

اس عجیب و غریب قصہ کو بیان کر کے مولانا روم کہتے ہیں کہ دنیا میں ہر شخص اپنے ہنر پر ناز کر رہا ہے، بڑے بڑے اہل ہنر اپنی بدمستیوں میں مست، اور خدا

سے غافل ہیں، لیکن کل قیامت کے دن، ان کے یہ ہنر کچھ کام نہ آئیں گے، بلکہ یہی دنیوی ہنران کو مبتلاءِ قہر وعذاب کردیں گے، اوراس کے برخلاف جن لوگوں نے اس دنیا کے اندھیرے میں اپنے حقیقی بادشاہ اللہ عزوجل کو پہچان لیا، اوراس کی معرفت اپنے دلوں میں پیدا کرلی، قیامت کے دن یہ خود بھی نجات پائیں گے، اور ان کی سفارش گنہگاروں کے حق میں قبول کی جائے گی۔

یادرکھو کہ دنیا کے اندھیرے میں اللہ کو پہچاننے کا ہنرسیکھ لیا، تو پھر دوسرے ہنرسیکھنا کچھ مضر نہیں، کیونکہ پھر کوئی بھی ہنر آپ کو اللہ سے غافل نہیں کرسکتا، ڈاکٹر انجینئر بننا منع نہیں ہے، بشرطیکہ آپ اللہ سے غافل نہ ہوں، اس حکایت سے معلوم ہوا کہ چشم سلطان شناس ہی کام آئی، باقی ہنر تختہ دار پر لے گئے، اسی طریقہ پر دنیا کے تمام کاروبار جو اللہ سے غافل ہوکر کئے جاتے ہیں، وہ آخر کار انسان کو تباہی وبربادی میں ڈالدیتے ہیں، لیکن جب کوئی شخص اللہ کی معرفت کا نور حاصل کرلیتا ہے اور وہ اللہ سے غافل ہونے کے بجائے اللہ کا عاقل بن جاتا ہے، تو وہ شخص خود بھی نجات پاتا ہے، دوسروں کو بھی نجات دلانے کا ذریعہ بن جاتا ہے، اس لئے سب سے بڑی چیز اللہ کی معرفت ہے۔

اللہ کے بارے میں باخبر سے پوچھو

اللہ کی ذات کو پہچاننا بہت آسان ہے، اس کی صفات کے ذریعہ، اس کے افعال کے ذریعہ، جو اللہ کی طرف سے ہم کو روزانہ دکھائے جاتے ہیں، مثلاً کبھی بارش ہورہی ہے، کبھی گرمی پڑرہی ہے، کبھی سیلاب آرہا ہے، کہیں عذابات کا سلسلہ جاری ہے، کوئی بیمار ہورہا ہے، کوئی شفایاب ہورہا ہے، کسی کی موت ہورہی ہے اور کسی کی پیدائش ہورہی ہے، یہ ساری چیزیں اللہ کی معرفت کے ذرائع ووسائل ہیں، آدمی کو

اس میں غور وفکر کے نتیجہ میں اللہ کی معرفت نصیب ہوتی ہے، اللہ سے ہم وہ آنکھ مانگیں، جو اس دنیا کے اندھیرے میں اللہ کو پہچان لے، قیامت کے دن یہی آنکھ باعث نجات ہوگی۔

اللہ کو کس طرح پہچانیں؟ اس کا طریقہ خود اللہ نے ارشاد فرمایا: اَلرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا رحمٰن کو جاننے کے لئے ان بندوں کے پاس جاؤ جو رحمٰن سے باخبر ہیں، حضرت تھانویؒ نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ رحمٰن کے بارے میں کسی باخبر سے پوچھو، اگر کسی جاہل سے جاکر پوچھو گے تو وہ کیا بتائے گا، جیسے کسی نے اپنے زمانے کے بادشاہ کے بارے میں کہا تھا کہ ہمارا بادشاہ تو اتنا بڑا ہے، اتنا بڑا ہے کہ دس ہاتھیوں کے برابر ہے، اس بے وقوف کی نظر میں ہاتھی بڑا جانور تھا، اس نے پھر قیاس کیا، اندازہ لگایا ہوگا کہ جب ہاتھی اتنا بڑا ہے تو ہمارا بادشاہ دس ہاتھی کے برابر ہوگا، ورنہ وہ ہاتھی سے چھوٹا رہ جائے گا جو اس کی شان سے گری ہوئی بات ہوگی۔

مگر حقیقت میں یہ تو بے وقوفی ہوئی، اور اس کی بے وقوفی نے بادشاہ کیلئے ایسی بے تکی بات نکلوادی، اس لئے کسی باخبر سے معلوم کرو کہ اللہ کیا ہے؟ خبیراً کی تفسیر علامہ آلوسی نے کی ہے" **المراد فاسئل عارفاً یخبرک**"، خبیراً سے مراد عارفین ہیں، اللہ کو پہچاننے والے اور ان کی صحبت کی برکت ہی اللہ کی معرفت کا ذریعہ بنتی ہے۔

(روح المعانی:۱۹/۳۹)

دنیا کی حقارت، ایک عمدہ مثال

فرمایا کہ اللہ تعالی نے آدم کو شجرۂ ممنوعہ کھانے کی وجہ سے دنیا میں اس لئے بھیج دیا تھا کہ اُس پھل کو کھانے کے بعد قضاء حاجت کی ضرورت پیش آئی اور پیٹ میں ہل چل مچ گئی، بے چینی و بے قراری بڑھ گئی، مگر جنت میں بیت الخلاء نہیں

ہے،اس کی فیسیلیٹی {facility} وہاں نہیں ہے،اس لئے کہ جنت تو پاکیزہ مقام ہے،اوراللہ نے اس کواس طرح بنایا ہے کہ وہاں قضائے حاجت کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی،اور جو بھی کھائیں گے وہ ہضم ہو جائے گا،اللہ نے وہاں کی غذاؤں میں فضلہ نہیں رکھا ہے،الغرض حضرت آدم سے کہا گیا کہ جنت کا بیت الخلاء تو دنیا ہے،اس لئے آپ جنت سے دنیا میں چلے جاؤ،اس سے معلوم ہوا کہ حضرت آدم کو اوران کی وجہ سے ان کی ذریت کو دنیا میں حاجت پوری کرنے بھیجا گیا تھا کیونکہ جنت میں اس کا انتظام نہیں تھا۔

اس کے بعد حضرت والا نے چند نصیحت آمیز باتیں بیان فرمائیں:

۱-جس جنت کا بیت الخلاء (دنیا) ایسا ہو،جس میں ہرے بھرے باغات بھی ہیں،عمدہ قسم کے محلات بھی ہیں،جس میں بلند پہاڑ بھی ہیں،تو اس جنت کا کیا حال ہوگا،وہاں کے باغات کا کیا عالم ہوگا،وہاں کے محلات کیسے ہونگے،لہذا انسان کو چاہئے کہ وہ اس ناپاک دنیا کے جھگڑوں میں نہ پڑے،بلکہ جنت جیسی حسین چیز کی طلب میں کوشاں رہے۔

۲-بیت الخلاء سے انسان بقدر ضرورت ہی استفادہ کرتا ہے،یعنی جس وقت تقاضہ ہو،اُسی وقت جاتا ہےاورضرورت پوری ہونے کےفوراً بعد واپس آجاتا ہے،اسی طرح انسان کو دنیا (جو جنت کا بیت الخلاء ہے) کے مال ومتاع،آل واولاد سے انتفاع بھی ضرورتاً اور بقدر ضروت ہی کرنا چاہئے،معلوم ہوا جو انسان دنیاء کی چیزوں میں اس طرح مگن ہوجاتا ہے کہ اسے آخرت کی تیاری کی فکر ہی نہ ہوتو وہ ایسا ہی ہے،جیسے کوئی بیت الخلاء میں جاکراُسی کو سب کچھ سمجھ لےاور دوسری عمدہ چیزوں سے غافل ہوجائے۔

۳- جتنا وقت انسان کا بیت الخلاء میں قضائے حاجت کے لئے صرف ہوتا ہے یعنی ۵ یا ۱۰ منٹ، انسان کو سمجھنا چاہئے کہ دنیا میں اس کی حیات بھی اسی قدر قلیل ہے۔

۴- بیت الخلاء میں جا کر کوئی بھی انسان وہاں عیش وعشرت کی تمنا نہیں کرتا، بلکہ ضرورت پوری ہونے کے بعد فوراً چلا آتا ہے، اور اگر کوئی یہ خواہش کرنے لگے تو سب اس کو احمق و پاگل کہیں گے، اسی طرح دنیا (جو کہ جنت کا بیت الخلاء ہے) میں بھی عیش وعشرت کی تمنا کرنا، بے وقوفی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

شیطان کی دعاء بھی قبول ہوئی

فرمایا انسان چاہے جتنے بھی گناہ کرلے، مگر ایک بار وہ دربار الٰہی میں آکر سر بسجود ہو کر سچی توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اُس کی بھی سنی جائے گی، پھر فرمایا شیطان نے عجیب وغریب موقعہ پر عجیب دعاء کی، اُس وقت دعاء مانگی، جب کہ اللہ تعالیٰ شیطان کی نافرمانی (یعنی آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کرنے) کی وجہ سے شیطان لعین پر نہایت غضبناک تھے، اور دعا مانگی بھی تو ایسی عجیب کہ کوئی ایسی دعاء نہیں مانگتا، اس نے دعاء یہ کی کہ: ''رَبِّ أَنْظِرْنِیْ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ'' (اے اللہ مجھے قیامت تک مہلت عطاء فرما)

غور کرنے کی بات ہے کہ ایسی دعاء کو بھی تعالیٰ نے ایسے غضبناک ہونے کے باوجود شیطان جیسے نافرمان کے حق میں قبول فرمائی، تو کیا انسانوں میں سے کوئی اس خالق سے مانگے تو شنوائی نہیں ہوگی؟ کیوں نہ ہوگی، ضرور ہوگی، اس لئے اللہ سے ناامید نہیں ہونا چاہئے۔

غیر مستند واعظ سے احتراز کرو

ایک مرتبہ بنگلور میں ڈاکٹر ذاکر نائک کا خطاب تھا، تو ایک صاحب (جو حضرت والا سے اصلاحی تعلق رکھتے ہیں) ان کے خطاب میں شرکت کرنے کی اجازت چاہی، تو حضرت نے پوچھا کہ ان کے خطاب میں کیوں جانا چاہتے ہو؟ تو انہوں نے کہا کہ حضرت! وہ بعض اشکالات جو اسلام پر کئے جاتے ہیں، ان کے جوابات دیتے ہیں، اس پر حضرت والا نے فرمایا: اگر تم وہاں گئے، اور اعتراض وجواب سنے، بالفرض کسی اعتراض کے جواب سے جو انہوں نے دیا ہے، تمہیں تشفی نہ ہوئی، تو تم خواہ مخواہ دل میں اسلام کے خلاف اعتراض لئے رہوگے، اس کی کیا ضرورت ہے، اللہ نے تمہارے دل کو اسلام سے مطمئن رکھا ہے، اس کا شکر کرو۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے اگر کوئی کہے کہ ایک صاحب ہیں جن پر کچھ لوگ پتھراؤ کرتے ہیں اور وہ صاحب اس کا بچاؤ کرتے ہیں، اور بہت سے لوگ اس کو دیکھنے جمع ہوتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ اس بچاؤ کو دیکھنے جانا حماقت ہے، کیونکہ اگر خدانخواستہ کوئی پتھر ان دیکھنے والوں کو لگ گیا جن کو بچاؤ کی یہ تدبیر نہیں آتی تو خواہ مخواہ ہلاکت میں پڑنا ہوا۔ اور یہاں تو جان کی ہلاکت ہے اور ان مجالس میں جانے سے ایمان کی ہلاکت کا ڈر ہے، کہ کوئی شبہ دل میں گھر کر گیا اور ایمان رخصت ہوا۔

اسی لئے اس طرح کی مجالس نہ صحابہ کے زمانے میں ہوتی تھیں اور نہ اس کے بعد کے دوروں میں سلف سے ثابت ہیں، اگر کسی کو اشکال ہو تو اس کا جواب اسی کو دیا جانا چاہئے، نہ یہ کہ جن کو اشکال نہیں ہے ان کو بھی خواہ مخواہ اشکالات سنائے جائیں۔

اللہ کی نعمت کا اندازہ کرو، ایک بزرگ کا قصہ

ایک بادشاہ نے کسی بزرگ سے نصیحت کرنے کی درخواست کی ،تو انہوں نے پوچھا کہ اگر تمہیں سخت پیاس لگے اور پانی میسر نہ آئے ، جان جانے کا اندیشہ ہو، ایسے وقت میں اگر کوئی کہے کہ ایک گلاس پانی میں دیتا ہوں اور تمہاری آدھی سلطنت اس کے عوض میں دینا پڑے گا ،تو تم کیا کروگے؟ بادشاہ نے کہا کہ آدھی سلطنت دے کر ایک گلاس پانی لے لوں گا ،تاکہ جان بچے۔

ان بزرگ نے پھر پوچھا کہ اگر خدانخواستہ اس پانی کے پینے کے بعد تمہارا پیشاب بند ہو جائے ،اور اطباء کہیں کہ اس کا علاج ہوسکتا ہے، اگر آدھی سلطنت اس کے عوض میں ہمیں دیدوگے ،تو علاج کر کے پیشاب جاری کریں گے ،تم کیا کروگے؟ بادشاہ نے کہا کہ آدھی سلطنت دے دوں گا اور علاج کراوں گا ،تاکہ جان بچ جائے ، تو اب اُن بزرگ صاحب نے عجیب بات فرمائی کہ اس سے معلوم ہوا کہ تمہاری کل سلطنت کی قیمت صرف ایک گلاس پانی اور ایک کٹورا پیشاب کے برابر ہے، شکر کرو اُس اللہ کا ، جو تمہیں روزانہ پچاسوں گلاس پانی مفت پلا رہا ہے، اور غور کرو اس کی قدرت پر جس سے کتنا پیشاب بغیر کسی معاوضہ کے باآسانی نکل جاتا ہے، اگر اللہ بھی اپنی نعمتیں عوضاً دینے لگے ،تو انساں کا جینا مشکل ہو جائے۔

ہر شخص روزانہ اللہ کی عطاء کردہ نعمتوں کو سوچا کرے، اور اس کا شکر بجالائے ، اس سے ایک طرف اللہ کی معرفت نصیب ہوتی ہے اور دوسری طرف نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

آئینہ چینی شکست

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ جو بڑے اولیاء اللہ میں سے ہیں، ان کو کسی نے

چین کا بنا ہوا ایک آئینہ دیا، حضرت نے اس کو لیکر کہا ''الحمد لله''، پھر انہوں نے اپنے خادم کو دیا کہ اس کو رکھو، جب ضرورت ہوگی لیکر اس میں چہرہ دیکھوں گا، اتفاق سے وہ ان کے خادم کے ہاتھ سے ٹوٹ گیا، تو اس نے خدمت میں حاضر ہو کر ڈرتے ڈرتے کہا: ''از قضا آئینہ چینی شکست'' (اللہ کی قضا و فیصلہ سے چینی کا آئینہ ٹوٹ گیا) اور اس کو یہ خیال تھا کہ اس پر مجھے ڈانٹ پڑے گی کہ تم نے اس کو کیوں توڑا؟ مگر حضرت نے اس کے جواب فرمایا کہ ''ا لحمد لله کہ آلۂ خود بینی شکست (اللہ کا شکر ہے کہ خود بینی کا آلہ ٹوٹ گیا)، خادم نے کہا کہ حضرت! جب آئینہ آیا تھا تب بھی آپ نے الحمدلله کہا، اور اب یہ ٹوٹا تو بھی الحمدلله کہا، فرمایا کہ ہاں! یہ اللہ ہی کا ہے، جب وہ دے تو بھی الحمدللہ، اور اس کا شکر ہے اور اگر وہ لے لے تو بھی الحمدلله۔

اولیاء اللہ کی نظر اشیاء پر نہیں ہوتی بلکہ خالق اشیاء پر ہوتی ہے، وہ ہر وقت اسی پر نظر جمائے ہوئے ہوتے ہیں۔

اللہ کی نعمتوں کو شمار نہیں کر سکتے

فرمایا: ایک صاحب میرے پاس آکر کہنے لگے کہ حضرت! دعاء کریں، میرے کچھ مسائل اٹکے ہوئے ہیں، میں یہ کرنا چاہتا ہوں مگر یہ کام نہیں ہوتا اور وہ کام کرنا چاہتا ہوں وہ نہیں ہوتا، اس طرح میرے سب کام ادھورے اور ناقص رہ جاتے ہیں، میں بہت پریشان ہوں۔

میں نے ان سے کہا: آپ ان دو چار مسائل کو لیکر شکوہ کرنے لگے، مگر آپ کی نظر ان ہزاروں مسائل کی طرف نہیں گئی، جن کا خود آپ کو علم نہیں، مگر اللہ ان کو پورا کر رہا ہے، آپ کو یوں سوچنا چاہیے، میرے کتنے کام ایسے ہیں جن کو میں سوچتا ہوں

فوراً ہوجاتے ہیں، پھر میں نے کہا کہ آپ صبح اٹھے ہوں گے، تو آپ نے چاہا ہوگا کہ میں بستر سے اٹھوں اور فوراً اٹھ گئے، اور چلنا چاہا، چلنے لگے، استنجاء کرنا چاہا ہوگا، وہ بآسانی ہوگیا، ایسے ہزاروں مسائل ہیں، جو آپ سوچتے ہی فوراً ہوجاتے ہیں، اور یہ سب بھی اللہ کی مدد سے ہوتے ہیں، مگر ان کی طرف آپ کی نظر نہیں جاتی اور اس کی وجہ سے اللہ سے شکوہ پیدا ہوتا ہے، پھر میں نے کہا کہ یہ بھی سوچئے کہ اگر اللہ آپ کے پیروں کو اکڑوا دیتا، وہ چلنے سے عاجز ہوجاتے، تو آپ کیا کرتے، ہاتھوں کو بھی ایسا کر دیتا تو کیا کر لیتے ؟ خدا کی قسم ! آپ دن بھر کی نعمتوں کا اگر اندازہ کرنا چاہیں تو نہیں کرسکتے، پوری زندگی کی نعمتوں کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟ خود حق تعالیٰ نے فرمایا ہے: اِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ لَا تُحۡصُوۡهَا (اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو شمار نہیں کرسکتے)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عام طور پر جن کو اللہ تعالیٰ سے شکوہ ہوتا ہے وہ صرف اس طرف نظر ڈالتے ہیں کہ ہمارا یہ اور وہ کام نہیں ہورہا ہے، اگر وہ لوگ یہ سوچا کریں کہ ہمارے روزانہ کتنے کام بغیر سوچے اور بغیر کوشش ومحنت کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انجام پارہے ہیں تو ان کا سارا شکوہ ختم ہوجائے اور وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے سامنے سرنگوں ہوجائیں۔

لقمان حکیم کا شکر

لقمان حکیم کسی کے غلام تھے، ایک مرتبہ باغ میں ان کا آقا آیا اور ایک پھل کاٹ کر حضرت لقمانؑ کو دیا، تو وہ مزہ لیکر کھانے لگے، جب ایک ٹکڑا اس نے خود کھایا، تو معلوم ہوا کہ بڑا اکڑوا پھل ہے، اس نے تھوک دیا اور کہنے لگا کہ لقمان! تم کو یہ پھل کڑوا نہیں لگ رہا ہے؟ تو حضرت لقمانؑ نے جواب دیا کہ آپ کے ہاتھ سے

میں نے کتنی میٹھی میٹھی چیزیں کھائی ہیں، آج ایک مرتبہ آپ کڑوا پھل کھلا دیں، تو کیا میں شکوہ کروں؟

اللہ اکبر! کیسا عجیب جواب دیا، اگر ہم بھی اللہ کے بارے میں ایسا ہی خیال کریں، تو ہماری کیا حالت ہوگی؟ اللہ کو ناشکری پسند نہیں، اگر شکر کروگے تو نعمت میں اضافہ ہوگا، لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَ زِيْدَنَّكُمْ اگر اللہ مال دیدے تو بھی خوش رہو، اور نہ دے تو بھی خوش رہو اور صحت دے تو بھی راضی رہو، بیماری دے تو بھی خوش رہو۔

نیکیوں کی توفیق سب سے بڑی نعمت ہے، ایک واقعہ

فرمایا: لوگ عموماً نعمت، صرف مال و دولت کو سمجھتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالی کی طرف سے کسی کو طاعت و عبادت کی توفیق مل جائے، تو یہ بہت بڑی دولت ہے، اس سے بڑی نعمت اور کیا ہوسکتی ہے؟ مگر لوگ اسکو نعمت سمجھتے ہی نہیں، اس پر حضرت والا نے ایک واقعہ سنایا کہ ایک بزرگ ایک بستی سے دوسری بستی کو جارہے تھے، جب دوسرے شہر کے قریب ہوئے تو دیکھا کہ شہر پناہ کے دروازے بند ہیں، اور دن کا وقت ہے، ان کو بڑا تعجب ہوا کہ دن میں شہر کا دروازہ کیوں بند ہے؟ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس شہر کے بادشاہ کا ایک پالتو پرندہ باز اُڑ گیا ہے، جس کی تلاش جاری ہے، اور دروازے بند اس لئے ہیں، تاکہ باز شہر کے اندر ہی رہے، اور دروازہ سے کہیں باہر نہ چلا جائے۔ ان بزرگ نے سوچا کہ کتنا بڑا بے وقوف بادشاہ ہے کہ باز تو اُوپر جو کھلی فضاء ہے، وہاں سے بھی جاسکتا ہے، اسے اتنی بھی عقل نہیں اور اس نے شہر پناہ کا دروازہ بند کروادیا ہے۔

پھر وہ بزرگ اللہ کی طرف مخاطب ہوکر کہنے لگے کہ اے اللہ! تو نے حکومت وسلطنت اور مال و دولت اس بے وقوف بادشاہ کو دے دی ہے، جو عقل سے بالکل

عاری ہے، اور مجھ جیسے عاقل کو کچھ نہیں دیا، تو اللہ کی طرف سے الہام ہوا کہ کیا آپ اس پر راضی ہیں کہ اس کی بے وقوفی وحماقت کے ساتھ آپ کو یہ دولت وحشمت اور حکومت وسلطنت اور جاہ وجلال سب کچھ اس بادشاہ سے چھین کر آپ کو دے دی جائے اور آپ کی عقل مندی اور تقوی شعاری، نیکیاں اور طاعتیں سب اُس کو دے دی جائیں؟ تو ان بزرگ کو فوراً احساس ہوا اور اللہ سے معافی مانگی اور کہنے لگے کہ یا اللہ! مجھے تقویٰ والی دولت زیادہ پسند ہے، اگرچہ غریبی کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو، اور یہ حکومت وسلطنت اس کی بے قوفی و بے ایمانی سمیت لینے سے تو ایمان وعمل کے ساتھ فقر وفاقہ ہی بہتر ہے۔

قلب اللہ کا مکان ہے

اپنے دل کو دنیا اور اس کی محبت اور تمام نفسانی خواہشات سے پاک وصاف رکھنا چاہئے، کیونکہ یہ دل تو اللہ کا گھر ہے، اس کی پاکیزگی دوسرے اعضاء اور دوسری اشیاء کے مقابلہ میں بہت زیادہ ضروری ہے۔ آج لوگ ذرا سے کپڑے میلے ہو جائیں، تو نکال دیتے ہیں مگر دلوں کا حال یہ ہے کہ اس میں نجاست ہی نجاست بھری ہوئی ہے، مگر اس کے صاف کرنے کی کسی کو فکر نہیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: تم اپنے گھروں کے صحن کو پاک وصاف رکھو۔ (ترمذی شریف: ۲۷۳۲)

جب نبی اکرم ﷺ گھروں کے صحن کو بھی پاک وصاف رکھنے کا حکم فرما رہے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب گھر کے صحن کو پاک رکھنا ضروری ہے تو گھر کے اندر کا حصہ پاک رکھنا بدرجۂ اولی ضروری ہے، اسی طرح جب ظاہر کے صاف رکھنے کا حکم ہو، تو باطن کو پاک رکھنا کتنا ضروری ہوگا؟

یہاں ایک بات سمجھ لیں ،وہ یہ کہ قلب ایک ایسی شیء ہے، جو دکھائی نہیں دیتی، بلکہ وہ تو ایک روحانی شیء ہے ، اسی لئے قرآن میں فرمایا :اِنَّ فِيۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِمَنۡ کَانَ لَہٗ قَلۡبٌ اَوۡ اَلۡقَی السَّمۡعَ وَھُوَ شَہِیۡدٌ کہ جس شخص کا دل ہے،اس کے لئے نصیحت کارگر ہوتی ہے،اب سوال یہ ہے کہ قلب تو کافر کے پاس بھی ہے،ملحد کے پاس بھی ہے،تو کیا قرآن سب کو کارگر ہے؟اس کا جواب یہ ہے کہ اس قلب سے روحانی قلب مراد ہے ،وہ گوشت کا لوتھڑا مراد نہیں جس میں کافر ومؤمن سب شریک ہیں،اوریہی روحانی قلب رب کا مکان ہے،حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بلاشبہ اللہ کے لئے اہل زمین کے برتن ہیں اور تمہارے رب کے برتن اس کے نیک بندوں کے قلوب ہیں،اوراس کے نزدیک پسندیدہ قلوب وہ ہیں جو نرمی اوررقت والے ہیں۔ (المقاصد الحسنۃ:۴۳۹)

بھائی!اب ذراغور کرو کہ جب ایک معمولی انسان کسی کے گھر آجائے،تو گھر کوکتنا پاک وصاف کیا جاتا ہے،اس کو کتنا سجایا جاتا ہے،جب یہ دل خدا کا گھر ہے،تو کیا اس کو گندا و ناپاک رکھا جا سکتا ہے؟ کیا انسان کی قدر ہمارے نزدیک خدا سے بڑھی ہوئی ہے، کہ ہم اپنے گنا ہوں، خطاؤں کے گھر میں اس کو پانا چاہتے ہیں،اس لئے بھائی!اس دل کوسنوارو،سجاؤ،خوبصورت بناؤ،خدا کی محبت سے اپنے دل کوحسین وجمیل بناؤ،اس کے بعد دیکھنا کہ خدا کیسے دل میں آتا ہے۔

حضرت خواجہ مجذوب صاحب کا ایک شعر یاد آ گیا:

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

اوراسی مضمون پر میرے بھی دو اشعار ملاحظہ کیجئے:

نقش لیلیٰ ہو چکا ہے پاش پاش عشق مولیٰ اب تو حاصل ہو گیا

اب تو یہ دل تیرے قابل ہو گیا　　ہو گئی ہے ہر تمنا دل سے دور

اس میں اشارہ ہے کہ جب تک دل کو غیر اللہ اور دنیوی محبتوں سے خالی نہیں کیا جائے گا اس وقت تک اللہ دل میں نہیں آ سکتا۔ اس لیے دنیوی و فانی لیلیٰ کو مولی کے لیے قربان کردو۔

جذبۂ شکر پیدا کرنے کا طریقہ: ایک واقعہ

فرمایا: آدمی ہمیشہ ہر دنیوی چیز میں اپنے سے نیچے کے طبقہ والوں کو دیکھے تو شکر کرے گا، اگر اپنے سے اونچے طبقہ والوں کی طرف نظر کرے گا تو ناشکری میں مبتلاء ہوگا، یعنی اگر کوئی متوسط درجہ کا مالدار ہے تو وہ غریبوں کو دیکھے، اور شکر ادا کرے کہ اللہ نے مجھے اس سے اچھا رکھا ہے، اسی طرح کسی کو اللہ نے معمولی سا گھر دیا ہے، تو وہ جھونپڑی میں رہنے والے کی طرف نظر کر کے شکر ادا کرے کہ اللہ نے مجھے مکان تو دیا ہے، اس کے برخلاف اگر متوسط درجہ کا مالدار اپنے سے بڑے مالدار کی طرف نظر کرے گا، تو حرص میں یا حسد میں مبتلا ہوگا، اور ناشکری کرے گا کہ اللہ نے اس کو اتنا مال دیا ہے اور مجھے نہیں دیا۔

اس کے بعد حضرت والا نے شیخ سعدی کا واقعہ سنایا کہ وہ ایک مرتبہ گھر سے نکلے تو پیر میں پہننے کے لئے جوتے نہیں تھے، دل ہی دل میں کہنے لگے کہ اللہ نے مجھے جوتے بھی نہیں دیئے ہیں، پھر پیدل تھوڑی دور گئے، تو دیکھا کہ ایک فقیر بھیک مانگ رہا ہے، جس کے دونوں پیر رانوں تک کٹے ہوئے ہیں، یہ منظر دیکھ کر شیخ سعدی نادم ہوئے، اور اللہ سے کہنے لگے کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ مجھے صرف جوتے نہیں دیئے، اس بیچارہ کو تو پیر ہی نہیں دیئے ہیں، اگر تو مجھے بھی اس جیسا بناتا تو میں کیا کرسکتا تھا؟

دل زنگ آلود ہو جاتا ہے

ایک مرتبہ حضرت والا کے پاس دفتر میں جو فون تھا، اس پر گردوغبار پڑا ہوا تھا، رومال سے ایک بار جھاڑا گیا، تو وہ صاف ہوگیا، یہ دیکھ کر حضرت اقدس نے فرمایا: دل کی مثال بھی ایسی ہی ہے کہ گناہوں کی وجہ سے اس پر گرد آتا رہتا ہے، اس لئے روزانہ ہم دل کو استغفار کی کثرت، ذکر، تسبیح وغیرہ سے جھاڑتے رہیں گے، تو وہ صاف شفاف آیئنہ کی طرح رہے گا، جس کی وجہ سے طاعت میں حلاوت آئیگی، نیکیوں میں جی لگے گا، اور اگر یوں ہی بغیر صفائی کے چھوڑ دیں گے، تو اس دل پر گناہوں کی دھول جمتے جمتے، وہ دل زنگ آلود ہو جائے گا، جیسے قرآن کریم میں ہے:
كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (ان کے دلوں پر زنگ آ گیا ہے)۔

(سورۃ التطفیف:۱۴)

پھر جس طرح برتنوں وغیرہ میں زنگ آ جائے، تو اسکی صفائی دشوار ہوتی ہے، اسی طرح دل کی صفائی بھی مشکل ہوگی، اس لئے اس کی صفائی بار بار کرتے رہنا چاہئے۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

"ان هذه القلوب تصدأ كما يصدأ الحديد اذا أصابه الماء، قيل يا رسول الله !وما جلا ئها ؟ قال: كثرة ذكر الموت وتلاوة القرآن"

کہ بلا شبہ ان دلوں پر زنگ آ جاتا ہے، جیسے لوہے پر زنگ آ جاتا ہے جب اسے پانی لگ جاتا ہے، پوچھا گیا: کہ اس زنگ کو صیقل کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ موت کی یاد اور تلاوت قرآن کی کثرت۔

(مشکوۃ شریف:۱۸۹)

جب موت کو یاد کرے گا، تو نرمی پیدا ہوگی، رونا آئے گا، جب روئے گا تو دل کی صفائی ہوگی، کیونکہ آنسوں کا قطرہ جہنم کی آگ کو بجھا سکتا ہے تو دل کے زنگ کو بھی ضرور دور کر سکتا ہے۔

دلوں پر زنگ کیوں آتا ہے؟

مرشدی حضرت شاہ ابرار الحق صاحبؒ نے فرمایا: دلوں پر زنگ آنے کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح لوہے کو جب پانی لگتا ہے، تو زنگ آجاتا ہے، کیونکہ پانی اور لوہے میں مناسبت نہیں ہے، دونوں میں جوڑ نہیں ہے، ناجنس کی صحبت کی وجہ سے اس کو زنگ لگتا ہے، اسی طرح سے جب دو بے جوڑ اور ناجنس چیزیں ملتی ہیں تو فتور پیدا ہوجاتا ہے، فرمایا کہ اسی طرح جب دل ناجنس اور بے جوڑ چیز، (یعنی گناہ) سے ملتا ہے، تو زنگ آجاتا ہے۔

بایزید بسطامی کے دودھ کا واقعہ

بایزید بسطامی بڑے اولیاء اللہ میں سے تھے، ان کا انتقال ہوا، تو کسی نے خواب میں ان کو دیکھ کر پوچھا کہ حضرت! اللہ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ تو جواب دیا کہ جب پیشی ہوئی تو اللہ نے پوچھا کہ بایزید! میرے لئے کیا لائے ہو؟ میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا: اے اللہ! کوئی عبادت اس لائق نہیں کہ تیری جناب میں پیش کرسکوں، سب میں عیب وقصور ہے، البتہ تیرے لئے توحید لایا ہوں، کیوں کہ میرا عقیدہ تو مضبوط تھا کہ تو ہی سب کچھ کرنے والا ہے، نفع کا مالک تو، نقصان کا مالک تو، مشکل کشا تو، حاجت روا تو، اس لئے میری جانب سے آپ کے لئے توحید خالص کا تحفہ پیش ہے۔

فرماتے ہیں کہ اللہ نے فرمایا کہ: اچھا، توحید لائے ہو، وہ دودھ کی رات والا قصہ یاد نہیں؟ تو میں نے لاعلمی ظاہر کی، تو اللہ نے خود یاد دہانی فرمائی اور کہا: ایک رات تم نے دودھ پیا تھا، پھر تمہارے پیٹ میں درد ہو گیا، تو تم نے کہا تھا کہ دودھ نے پیٹ میں درد پیدا کر دیا، بتاؤ، درد میں پیدا کرتا ہوں، یا دودھ کرتا ہے؟ کیا یہی تمہاری توحید ہے؟ جس کو تم میرے دربار میں پیش کرنا چاہتے ہو؟ جاؤ اس میں شرک کی آمیزش ہے، حضرت بایزیدؒ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا کہ اے اللہ! میرے پاس تو کچھ نہیں ہے، نہ کوئی عمل و نیکی، نہ ایمان و توحید، جو تیرے شایان شان ہو، اس لئے محض تیرے فضل سے معاف فرمادے۔

کسی شاعر نے قیامت کے میدان کا نقشہ کھینچا ہے، اور اپنے ایک شعر میں یہی مضمون بڑے عجیب انداز سے ادا کیا ہے:

نیکیاں جن کو میں سمجھا، وہ معاصی نکلے　　　کفر ہی کفر تھا، ایمان بڑی مشکل ہے

دین میں ایسی استقامت آجائے

دین پر استقامت بڑی چیز ہے اور یہی آجکل مفقود ہے، نوجوان لوگ دین پر آنا چاہتے ہیں، اور آتے بھی ہیں، مگر یہی استقامت نہ ہونے کی وجہ سے تعبیر بدلنا ہے کھاتے رہتے ہیں، نماز شروع کرتے ہیں، پھر چھوڑ دیتے ہیں، علم دین حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، پھر استقامت میں کمی سے وہ بجھ جاتا ہے۔

میں ایک واقعہ سناتا ہوں، جس سے استقامت کا جذبہ پیدا ہوگا، ہمارے حضرت مسیح الامتؒ نے ایک قصہ سنایا تھا کہ حضرت جنید بغدادیؒ کہیں جارہے تھے، راستہ میں دیکھا کہ ایک چور کو سولی پر چڑھایا جارہا ہے، حضرت جنید نے لوگوں سے پوچھا کہ کس جرم کی پاداش میں اسکو سولی پر لٹکایا جارہا ہے؟ بتایا گیا کہ یہ منع کر

نے کے باوجود چوری کرنے سے باز نہیں آتا، برابر چوری کرتا رہتا تھا، اس نے ایک دفعہ چوری کی تو اس کا ایک ہاتھ کاٹا گیا، دوسری دفعہ چوری کیا تو دوسرا ہاتھ کاٹا گیا، مگر یہ پھر بھی باز نہیں آیا، اس لئے یہ سزا دی جارہی ہے، یہ سن کر حضرت جنید نے فرمایا: میرا دل چاہتا ہے کہ اس کے پیروں کو بوسہ دوں، پوچھا گیا کہ حضرت! آپ اس چور کے پیروں کو بوسہ دیں گے؟ آخر کیوں؟ تو فرمایا: میں اس چور کو نہیں، بلکہ اس کے اندر کی استقامت کے پیروں کو بوسہ دینا چاہتا ہوں، اگر ایسی استقامت ہم دینی کاموں میں پیدا کرلیں تو معلوم نہیں کتنی ترقی کریں گے۔

انسان کو تین چیزیں ہلاک کرتی ہیں

فرمایا: انسان کو تین چیزیں ہلاک کرتی ہیں، اور تینوں کا نام منی ہے:

پہلی منی: جس کو اردو میں منی کہتے ہیں، یعنی نطفۂ ناپاک، یہ انسان کو ہلاک کرنے والا ہے، کیوں کہ دنیا میں جتنے بھی زنا کے واقعات، فحش وعریانی، بے حیائی، جنسی بے راہ روی کے واقعات رونما ہو رہے ہیں، یہ اسی نطفہ ناپاک کے غیر محل میں استعمال ہونے کی وجہ سے ہو رہے ہیں، اسی لئے ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص مجھے دو چیزوں کی ضمانت دیدے، میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں: ایک وہ جو دو جبڑوں کے درمیان ہے، (یعنی زبان) اور ایک وہ جو دو رانوں کے درمیان میں ہے (یعنی شرمگاہ)۔

(بخاری:٥٩٩٤، ترمذی:٢٣٣٢)

دوسری منی: دوسری منی وہ ہے جو انگریزی کا لفظ ہے (MONEY)، انگریزی میں منی (MONEY) کہتے ہیں روپیہ اور مال کو، یہ روپیہ پیسہ ومال تو سب سے بڑا فتنہ ہے، سب سے بڑا مہلک ہتھیار ہے، ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا

(اِنَّ لِكُلِّ اُمَّةٍ فِتْنَةً وَفِتْنَةُ اُمَّتِي الْمَالُ)

ترجمہ: بلا شبہ ہر امت کے لئے ایک فتنہ ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔

(ترمذی: ۲۲۵۸)

چناں چہ آج دنیا کے سارے جھگڑے اس مال ہی کی وجہ سے رونما ہو رہے ہیں، کوئی دھوکہ دے رہا ہے، کوئی چوری کر رہا ہے، کوئی اس مال کی خاطر سودی کاروبار میں ملوث ہو کر اللہ کی نافرمانی کر رہا ہے، مال کی محبت دل میں ایسی رچ بس گئی ہے کہ حرام وحلال کی تمیز بھی نہیں ہے، یہ سخت فتنہ اور ہلاک کرنے والی چیز ہے۔

مال و دولت کی مثال ایسی ہے جیسے پانی کہ جب تک وہ کشتی کے نیچے رہے تو ٹھیک ہے، اور نفع بخش بھی ہے، لیکن جب پانی کشتی کے اندر داخل ہو جائے گا، تو ساروں کو ہلاک کر دے گا، اسی طرح جب تک مال باہر باہر ہو تو ٹھیک ہے، مگر جب اس کی محبت دل میں داخل ہو گی، تو انسان کو اسی طرح ہلاک کر دے گا، جیسے کشتی میں پانی داخل ہو کر کشتی والوں کو ہلاک کر دیتا ہے۔

ایک حدیث میں آپ نے ﷺ فرمایا: (تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَالدِّرْهَمِ) (دینار اور درہم کا بندہ ہلاک ہو گیا) (بخاری: ۲۶۷۳، ابن ماجہ: ۴۱۲۶)

ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے پاس بحرین سے خراج کا مال آیا، چونکہ فقر و فاقہ کا دور تھا، بہت سارے صحابہ مال لینے جمع ہو گئے، نماز کے بعد آپ B نے فرمایا: شاید تم لوگ مال لینے جمع ہوئے ہو، پھر فرمایا: خدا کی قسم مجھے اس بات کا ڈر نہیں ہے کہ تم فقر و فاقہ میں مبتلاء ہو جاؤ گے، مجھے تو اس کا ڈر ہے کہ تم پر دنیا وسیع کر دی جائے اور تم اس میں جھگڑنے لگو جس طرح پچھلے لوگوں نے اس میں جھگڑا کیا تھا۔

(بخاری شریف: ۲۹۲۴، مسلم: ۵۲۶۱)

معلوم ہوا کہ یہ منی (MONEY) بھی بڑی خطرناک شیٔ ہے اور ہلاک کرنے والی ہے۔

تیسری منی :فارسی کا لفظ ہے، فارسی میں منی کہتے ہیں، میں پن کو، یعنی انانیت، تکبر کو، تکبر کے معنی اپنے آپکو بڑا سمجھنا اور دوسروں کو حقیر سمجھنا، یہ بڑی خطرناک روحانی بیماری ہے، بعض بزرگوں نے کہا ہے کہ کفر تکبر ہی سے پیدا ہوتا ہے، کیونکہ شیطان نے اسی تکبر کی وجہ سے اللہ کے حکم کو ماننے سے انکار کیا تھا، اس لئے تکبر انسان کو اسی طرح ہلاک کر دیتا ہے، جیسے شیطان کو تکبر نے ہلاک کر دیا، کیونکہ شیطان نے تکبر ہی کی وجہ سے سجدہ نہیں کیا تھا، اور ذلیل وخوار کر کے بارگاہ الٰہی سے نکال دیا گیا تھا۔

معلوم ہوا کہ کفر کی جڑ اصل میں تکبر ہے، اب اندازہ کرنا چاہئے کہ کفر جب سب سے بری چیز ہے تو جس سے کفر نکل کر آرہا ہے، جو مصدرِ کفر ہے، وہ کتنا برا ہوگا؟

اسی لئے اسلام میں تکبر کی سخت مذمت آئی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”لَایَدْ خُلُ الْجَنَّةَ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِنْ کِبَرٍ“ (جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں نہیں جا سکتا)۔ (مسلم:۱۳۲، ترمذی:۱۹۲۱)

اور قرآن کریم میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے:” وَلَاتَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّکَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا“

ترجمہ: تم زمین پر اتراتے ہوئے نہ چلو، کیونکہ تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو، نہ اونچائی میں پہاڑ تک پہنچ سکتے ہو)۔ (بنی اسرائیل:۳۷)

اور اس کے بالمقابل اللہ والوں کی صفات میں ہے: ”وَعِبَادُالرَّحْمٰنِ

الَّذِیۡنَ یَمۡشُوۡنَ عَلَی الۡاَرۡضِ ھَوۡناً“

ترجمہ: اوررحمان کے بندے وہ ہیں جوزمین میں تواضع کے ساتھ چلتے ہیں۔

(الفرقان:۶۳)

حضرت مولانا عبدالغنی پھولپوریؒ جوحضرت تھانویؒ کے جلیل القدر خلیفہ تھے انہوں نے ان دوآیات میں ایک نکتہ بیان کیا ہے،فرمایا کہ،پہلی آیت میں تکبر سے چلنے سے منع کیا گیا ہے،دوسری آیت میں اللہ والوں کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ عاجزانہ چال چلتے ہیں،اسمیں ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ پہلی آیت میں”فی الارض“ فرمایا ہے،جب کہ دوسری آیت میں” علی الارض “کہا گیا ہے،اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی آیت مقامِ مذمت میں ہے،اس لئے” فی“ لائے ہیں کہ تم زمین میں پیر مار مار کر نہ چلو کہ زمین ہی میں ہی گھس جاؤ،کیونکہ تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو،نہ اونچائی میں پہاڑ تک پہنچ سکتے ہو،اور دوسری آیت مقام مدح میں ہے،اس لئے وہاں”علی الارض“فرمایاہے،یعنی اللہ والے زمین پر عاجزانہ چال چلتے ہیں،اوپراوپر چلتے ہیں، زمین پر پیر مار مار کرنہیں چلتے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ عارفانہ تفسیر ہے،مفسرین عالمانہ تفسیر کرتے ہیں،اوراللہ والے عارفانہ تفسیر کرتے ہیں،تو معلوم ہوا رفتار میں تکبر نہ ہونا چاہئے، اسی طرح کردار بھی تکبرانہ نہ ہونا چاہئے۔ایک بزرگ نے فرمایا:انسان کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ماضی میں نطفہءناپاک تھا،موجودہ حالت یہ ہے کہ ہمیشہ اپنے پیٹ میں غلاظت لئے ہوئے پھرتا ہے،اورایک دن آئے گا کہ قبر میں جاکر جیفہءناپاک ہوجائے گا،تعجب ہے کہ پھربھی اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے،ڈینگیں مارتا ہے،اللہ تکبر سے ہماری حفاظت فرمائے۔

کبھی کتے سے بھی سبق مل جاتا ہے

امام شاہ ولی اللہ کے والد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب علیہ الرحمۃ ایک مرتبہ ایک راستہ سے گذر رہے تھے، اُسی راستہ میں دوسری طرف سے ایک کتا آرہا تھا اور راستہ اتنا تنگ تھا کہ کوئی ایک ہی اس پر سے گزر سکتا تھا، جب کتا قریب آیا، تو شاہ صاحب نے کہا: ارے کتے! تو نیچے اتر جا، اس لیے کہ میں نیچے اتروں گا، تو میرے کپڑے گندے ہوجائیں گے، اور مجھے نماز پڑھنا ہے، اور تجھے کیا؟ تو تو گندگی ہی میں رہتا ہے، گندا ہوگا، تو پھر صاف بھی ہوجائیگا۔

اللہ تعالیٰ نے کتے کو بولنے کی طاقت دیدی، کتا کہنے لگا، شاہ صاحب! آپ کی یہ بات تو صحیح ہے کہ اگر میں گندے نالے میں اتروں گا تو ناپاک ہوجاؤں گا، پھر پانی میں ایک ڈبکی لگاؤں گا، تو صاف ہوجاؤں گا، مگر آپ کے دل میں میری جو حقارت اور اپنی بڑائی آے گی، اس سے آپ کے دل میں جو نجاست پیدا ہوگی، وہ سات سمندروں کے پانی سے بھی ختم نہیں ہوسکتی۔

اللہ اکبر! یہ سن کر شاہ صاحب کتے سے معافی مانگنے لگے، اور اللہ کی جناب میں توبہ کی، آج ہم لوگ کتے تو کتے، انسانوں بلکہ اپنے سے بڑے وافضل لوگوں کی بھی تحقیر کرتے ہیں اور اپنے کو سب سے بڑا سمجھتے ہیں، غور کرو کہ ہمارے دلوں کی گندگی کا کیا حال ہوگا۔

اساتذہ کی بے ادبی کا عبرت ناک انجام

ایک واقعہ سناتا ہوں جو خود میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جو میرے طالب علمی کے دور میں پیش آیا ہے، ایک ہمارا ساتھی تھا، اور بہت ذہین تھا، ایک مرتبہ سنتا تو پورا سبق یاد ہوجاتا تھا، بڑا ہی ذہین، بڑا چالاک، اور صلاحیت واستعداد

والا تھا، وہ طلبہ کو تکرار کرایا کرتا تھا، مگر اس میں ناز و تکبر تھا، وہ اپنی تکرار میں یہ کہا کرتا تھا کہ میں اُستاذ سے بھی اچھا پڑھا سکتا ہوں، اور واقعی وہ بہت اچھے طریقہ سے تکرار کراتا تھا اور سارے طلبہ اس کو مانتے تھے، جب سہ ماہی امتحان ہوا تو مدرسہ کے تمام طلبہ میں اول نمبر پر کامیاب ہوا اور امتیازی نمبر حاصل کئے، مگر صرف تین ماہ بعد جب ششماہی امتحان آیا تو وہ بالکل زیرو نمبر آیا اور ناکام ہوگیا، اب یہ سوچنا ہے کہ سہ ماہی اور ششماہی میں کتنے مہینے ہوتے؟ بمشکل تین ماہ، اس کے باوجود اعلیٰ نمبرات سے کامیاب ہونیوالا زیرو نمبر سے فیل کیوں ہوگیا؟

اس کی وجہ یہی ہے کہ اس نے اپنے سے بڑوں کی، اپنے اساتذہ کی تحقیر کی، ان کو اپنے سے بڑا سمجھنے کے بجائے، اپنے سے چھوٹا سمجھا، اور ان کی بے ادبی کی اور یہ سب تکبر کی وجہ سے ہوا، اب معلوم نہیں وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے، کیسا ہے۔

طلبہ کو اس قصہ سے عبرت لینا چاہئے، اور اپنے اساتذہ اور بڑوں کا ادب کرتے رہنا چاہئے، ان کی تحقیر و توہین ہرگز نہ کرنا چاہئے، اسی سے علم آتا ہے، ورنہ اولاً تو علم نہیں آتا اور اگر آ گیا تو وہ علم نفع نہیں دیتا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اساتذہ اور مشائخ کے ادب کی توفیق دے اور بے ادبی سے حفاظت فرمائے۔ (آمین)

کسی کو حقیر نہ سمجھو

اساتذہ کی ہی کی نہیں اسلام میں تو کسی کی بھی توہین و تحقیر جائز نہیں، قرآن میں ہے:

”یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْھُنَّ“

اس میں یہ بتلایا گیا کہ کوئی مرد کسی مرد کو، کوئی عورت کسی عورت کو حقیر نہ سمجھے،

ہوسکتا ہے کہ جسے حقیر سمجھا جائے وہ حقیر سمجھنے والے سے اچھا ہو، اس لئے کہ کسی کے دل کے حالات سوائے اللہ کے کسی کو نہیں معلوم، بسا اوقات کسی کو حقیر سمجھتے ہیں، مگر اس کا تعلق اللہ سے بہت گہرا ہوتا ہے، جو بھی سالک کسی کو حقیر سمجھے گا، وہ کبھی ترقی نہیں کرسکتا، حتی کہ گنہ گار کو بھی حقیر نہ سمجھو، حضرت مسیح اللہ خان صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ: گناہ کو تو حقیر سمجھو، مگر گنہگار کو حقیر نہ سمجھو، پھر حضرت والا نے مثال دی، جیسے بچہ کو اگر پاخانہ لگ جائے، تو ماں اس بچہ کو گندا نہیں سمجھتی، بلکہ اس کی نجاست کو برا سمجھتی ہے، کیا عمدہ مثال دی حضرت نے، پھر فرمایا کہ ماں اس نجاست کو پیار و محبت سے صاف کرتی ہے، اسی طرح اگر کسی انسان کو گناہ میں مبتلا دیکھو تو پیار و محبت سے سمجھاؤ، حقارت سے نہیں۔

حقیر سمجھنے کا انجام، ایک عبرتناک حکایت

ابوعبداللہ اندلسیؒ حضرت شبلیؒ کے ساتھیوں میں ہیں، حافظ حدیث تھے، کئی ہزار احادیث یاد تھیں، وہ ایک مرتبہ کہیں جارہے تھے، راستہ میں کچھ لوگ بتوں کی پوجا میں مصروف تھے، ان کو دیکھ کر دل میں ان کی حقارت آگئی، اور دل میں کہنے لگے، یہ تو جانور سے بدتر ہیں، بس اسی پر اللہ کی پکڑ شروع ہوگئی، آگے بڑھے تو ایک لڑکی پر نظر پڑگئی، اس پر دل فریفتہ ہوگیا، اس سے جاکر کہا کہ میں تیرے ساتھ رہنا چاہتا ہوں، اس نے کہا کہ میرے والد سے بات کرو، انہوں نے اس لڑکی کے والد سے بات کی، تو اس نے کہا: میں دو شرطوں پر میری لڑکی سے تمہاری شادی کروں گا، ایک شرط یہ کہ تم عیسائی بن جاؤ، دوسری شرط یہ کہ میرے سوّر ہیں، ان کو چرانا ہوگا، چونکہ ان کا دل اس لڑکی کی طرف بہت مائل ہوچکا تھا، اس لئے انہوں نے ان دوشرطوں کو قبول کرلیا اور عیسائی بن گئے، بہت دنوں بعد ان کے پاس شبلی آئے،

دیکھا کہ عیسائی بن گئے ہیں اور خنزیر چرا رہے ہیں، شبلی نے کہا: تم کو کوئی آیت یاد بھی ہے؟ کہنے لگے کہ نہیں، صرف ایک آیت یاد ہے: ''**ومن یتبدل الکفر بالایمان فقد ضل سواء السبیل**'' (جو اپنے سچے دین کو بدل دے وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا) پھر شبلی نے دریافت کیا کہ احادیث میں سے کچھ یاد ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ہاں صرف ایک حدیث یاد ہے کہ نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا: (**من بدل دینہ فاقتلوہ**) جو مرتد ہو جائے اسے قتل کردو۔

(بخاری: ۲۷۹۴، ترمذی: ۱۳۷۸)

پھر ان پر اللہ کا فضل ہوا اور شبلی نے سمجھایا تو دوبارہ اسلام لائے، اس واقعہ میں آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کو یہ سزا مخلوق کی حقارت کرنے پر ملی، حالانکہ انہوں نے کافروں کو حقیر سمجھا تھا، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کافروں کو بھی حقیر نہیں سمجھنا چاہئے، بلکہ ان کے گناہ کو حقیر سمجھنا چاہئے۔

گناہ کر کے حقیر سمجھنا بہتر ہے

مکتوبات امام ربانی میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت مجدد الف ثانیؒ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت! میرے اندر دو حالتیں ہیں، ایک یہ کہ عبادت کرتا ہوں، تو تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہوں، دوسری یہ کہ اگر گناہ ہو جائے تو اپنے آپ کو حقیر سمجھتا ہوں، ان دو حالتوں میں سے بہتر کونسی حالت ہے؟

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ان کے جواب میں لکھا کہ: تمہاری دوسری حالت کہ گناہ کر کے اپنے آپ کو حقیر سمجھتے ہیں، یہ ہزاروں درجہ بہتر ہے پہلی حالت سے، جس میں عبادت کر کے فخر میں مبتلا ہو جائے۔ اللہ ہماری حفاظت فرمائیں، آمین۔

واعظین اپنے کو بڑا نہ سمجھیں

فرمایا: آج لوگ وعظ ونصیحت کر کے اپنے آپ کو بڑا اور مخلوق کو حقیر سمجھتے ہیں، یہ بڑی غلط بات ہے، حضرت تھانوی جو اپنے زمانے کے حکیم الامت مانے جاتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ جب میں کسی کو وعظ کہتا ہوں یا نصیحت کرتا ہوں، تو اپنے آپ کو یوں سمجھتا ہوں کہ بادشاہ نے حکم دیا ہے کہ شہزادہ کو یہ بات سنادو، اللہ اکبر! بہت بڑی بات فرمائی حضرت نے، جو انسان سامعین کو شہزادہ تصور کرے وہ ان کو حقیر کیسے سمجھ سکتا ہے؟ اس لئے کہ بادشاہ کسی خادم کے ذریعہ شہزادہ کو کوئی بات کہلوائے تو خادم شہزادہ سے بڑا نہیں ہو جاتا، مگر افسوس ہے کہ واعظین آج لوگوں کو حقیر سمجھتے ہیں اور ان کے لئے نامناسب القاب استعمال کرتے ہیں، اصلاح کی ضرورت ہے۔

ایک بزرگ کا قصہ

ایک بزرگ کسی بادشاہ کو زور زور سے ڈانٹنے لگے، تو اس نے کہا: حضرت! آپ موسیٰ علیہ السلام سے بڑے نہیں ہیں، اور میں فرعون سے گھٹیا نہیں ہوں، جب اللہ نے موسیٰ جیسے نبی کو فرعون جیسے کافر کے پاس بھیجا تھا تو اس سے بھی نرمی سے بات کرنے کی ہدایت دی تھی: ''فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلاً لَّیناً لَّعَلَّهٗ یَتَذَکَّرُ اَوْیَخْشٰی'' تو آپ مجھے اتنی شدت وسختی سے کیسے کہہ سکتے ہیں، کیا میں فرعون سے بھی گیا گزرا ہوں اور آپ موسیٰ سے بھی فائق ہیں؟

جو دل اللہ سے غافل ہو وہ مردہ ہے، بایزید بسطامی کا واقعہ

ایک مرتبہ ایک شخص حضرت بایزید بسطامی سے ملاقات کے شوق میں اپنے

وطن سے نکلا، سفر کرتا ہوا ایک راستہ میں ایک جگہ درخت کے سایہ میں آرام کرنے لیٹا ،تو دیکھا کہ دو چڑیاں آپس میں بات کررہی ہیں ،اور یہ شخص چڑیوں کی بولی جانتا تھا، درمیان میں حضرت نے فرمایا: اللہ تعالیٰ بعض بندوں کو چرند پرند کی بولی سکھا دیتے ہیں ، یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے، اور قرآن سے بھی ثابت ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ : وَعُلِّمْنَا مَنطِقَ الطَّيْرِ حضرت سلیمان نے فرمایا کہ ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے۔

الغرض ان میں سے ایک چڑیا دوسری چڑیا سے کہہ رہی تھی کہ معلوم ہے یہ آدمی جو درخت کہ نیچے ہے، کہاں جارہا ہے؟ دوسری چڑیا نے کہا: ہاں یہ بایزید بسطامی کے پاس جارہا ہے،تو اس چڑیا نے کہا: ان کا تو انتقال ہوگیا، یہ شخص یہ بات سن کر پریشان ہوا، اور واپسی کا ارادہ کرلیا، پھر سوچا کہ جب نکلا ہی ہوں تو جا کر زیارت کرلوں، پھر آگے سفر جاری رکھا، اور بایزید بسطامی کے پاس پہنچا،تو دیکھا کہ وہ تو باحیات ہیں، ملاقات کی، گفت وشنید کے بعد رخصتی کے وقت کہنے لگا کہ حضرت! ایک بات پوچھنا ہے، پھر چڑیا والا سارا قصہ سنایا، بایزید بسطامی چونکے اور دریافت کیا کہ یہ کس دن اور کس وقت کا واقعہ ہے؟ اس نے بتایا کہ فلاں دن اور فلاں وقت کا واقعہ ہے، حضرت بایزید کہنے لگے کہ ہاں بھائی! چڑیا سچ کہہ رہی تھی، اس وقت کچھ دیر کے لئے میرا دل اللہ سے غافل ہوگیا تھا، اللہ سے دل کا غافل ہونا، دل کا مردہ ہونا ہے۔

اللہ اکبر! ہمارا حال کیا ہے، ان کا دل تو کچھ دیر کے لئے مردہ ہوا تھا، ہمارا دل ہمیشہ مردہ رہتا ہے ، ہم اللہ کا ذکر ہی نہیں کرتے ، عجیب اور حیرت انگیز واقعہ ہے، اس واقعہ سے ہمیں عبرت حاصل کرنا چاہئے اور ہمیشہ اللہ کا ذکر کرنا اور اس کا

دھیان رکھنا چاہئے۔

جانور سے بھی اپنے کو افضل نہ سمجھے

فرمایا: میں حضرت مسیح الامتؒ کی مجلس میں شریک تھا، حضرت نے فرمایا: بچو! تم سب میرے سے افضل ہو، میں تم میں سب سے زیادہ حقیر ہوں، پھر فرمایا: میں تو خنزیر سے بھی حقیر ہوں۔

اللہ اکبر! یہ اللہ والے سب کچھ کرنے کے باد جود اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھتے، ہم کچھ کئے بغیر ہی اپنے آپ کو سب کچھ سمجھتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اپنے آپ کو خنزیر سے بھی افضل سمجھنے کی اجازت نہیں۔

ایک بزرگ کے سامنے کسی نے خنزیر کو برا جانور کہا جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے، تو انہوں نے کہا کہ تم غلط کہتے ہو، بُرے تو ہم ہیں، کیونکہ وہ تو اپنی ڈیوٹی پوری کررہا ہے جس کے لئے اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے، مگر ہم اپنی ڈیوٹی انجام نہیں دے رہے ہیں جس کے لئے اللہ نے ہمیں پیدا کیا، اب بتاؤ! ہم بہتر ہیں یا خنزیر بہتر ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ کی تواضع

ایک مرتبہ کوئی شخص امام اعظم ابوحنیفہؒ سے مسئلہ پوچھنے گیا، امام صاحب اُوپر کی منزل میں اپنے حجرے میں تھے، سائل نے آواز دیکر امام صاحب کو بلایا، امام صاحب جب نیچے اتر کر آئے تو کہنے لگا، حضرت! معاف کرنا، ایک مسئلہ معلوم کرنا تھا مگر میں بھول گیا کہ کیا مسئلہ تھا، امام صاحب کہنے لگے: کوئی بات نہیں، جب یاد آئے تو آکر پوچھ لینا، یہ کہہ کر امام صاحب اپنے کمرے میں اوپر تشریف لے گئے، جیسے ہی امام صاحب اُوپر چڑھے، تو اس شخص نے آواز دی کہ حضرت! یاد آگیا ذرا نیچے

آ یئے ،امام صاحب جب نیچے آئے تو کہنے لگا کہ عجیب بات ہے کہ میں پھر بھول گیا، امام صاحب پھر یہ کہکر تشریف لے گئے کہ یاد آئے تو معلوم کر لینا،مگر اس نے اسی طرح سات مرتبہ امام صاحب کواُوپر چڑھایا اور اتارا، یہ بلاتا اور کہتا کہ حضرت بھول گیا، آخری مرتبہ جب آپ آئے تو کہنے لگا کہ ہاں اب یاد آ گیا، یہ مسئلہ پوچھنا ہے کہ پاخانہ میٹھا ہوتا ہے یا پھیکا؟

غور کا موقعہ ہے کہ ایک تو اس نے سات دفعہ ان کو چڑھنے اور اُترنے پر مجبور کیا، پھر جو مسئلہ پوچھا تو ایسا بے ہودہ مسئلہ پوچھا، مگر امام ابو حنیفہؒ کی غایت تواضع دیکھئے کہ باوجود اس کے بے ڈھنگے سوال کے بالکل غصہ نہیں ہوئے، اور جواب بھی دیا اور فرمایا کہ پاخانہ جب تک تازہ ہوتا ہے، میٹھا ہوتا ہے،اور جب سوکھ جائے تو پھیکا ہو جاتا ہے،اس پر وہ کہنے لگا کہ آپ نے جو کہا ہے اس کی کیا دلیل ہے؟ اللہ تعالے نے امام صاحب کو حیرت انگیز قسم کی ذہانت دی تھی، آپ نے فرمایا کہ اس کی دلیل یہ ہے کہ: جب تک پاخانہ تازہ رہتا ہے، اُس پر مکھیاں بیٹھتی ہیں اور مکھیاں میٹھی چیزوں پر ہی بیٹھتی ہیں، اور جب وہ سوکھ جاتا ہے تو اس پر مکھیاں نہیں بیٹھتیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پھیکا ہو جاتا ہے۔

بوعلی سینا اخلاق ندارد

ابو علی سینا جو بہت بڑا حکیم گزرا ہے اس کے زمانہ میں ایک بزرگ تھے، اُنہوں نے ایک دفعہ بوعلی سینا کے بارے میں یہ کہد یا کہ بوعلی سینا اخلاق ندارد، یعنی بو علی سینا اخلاق نہیں رکھتا، یہ جملہ جب بوعلی سینا کو معلوم ہوا تو اُس نے اخلاقیات پر ایک بہترین کتاب تصنیف کر دی،اور اس میں اخلاق کی تمام تفصیلات جمع کر دیا،اخلاق کے اصول وفروع، اخلاق کی اقسام وانواع، اخلاق کے آثار ولوازمات، وغیرہ سب

کچھ لکھ دیا، اور ایک نسخہ اُن بزرگ صاحب کے پاس بھی بھیجا، جنہوں نے یہ کہا تھا کہ بو علی سینا اخلاق ندارد، تو کسی نے ان بزرگ سے عرض کیا کہ حضرت! آپ نے کہا تھا کہ بوعلی سینا اخلاق نہ دارد، اُس نے تو اخلاق پر اتنی زبردست کتاب لکھ کر بتا دیا ہے کہ وہ اخلاق جانتا ہے، حضرت نے کہا کہ میں نے کب یہ کہا تھا کہ بوعلی سینا اخلاق نداند کہ بو علی سینا اخلاق جانتا نہیں، میں نے تو یہ کہا تھا کہ اخلاق ندارد، یعنی وہ اخلاق رکھتا نہیں، جاننا الگ بات ہے، رکھنا الگ بات ہے، کتاب لکھ دینا الگ بات ہے اور اُسے عملی جامہ پہنانا الگ بات ہے۔

کرتے رہے پھر بھی ڈرتے رہے

صید الخاطر میں ابن الجوزیؒ نے لکھا ہے کہ وہ ایک مرتبہ بیان فرما رہے تھے اور سامعین میں دس ہزار کا مجمع تھا، اور ان کا وعظ سن کر پورے کا پورے مجمع رو رہا تھا، سوچو کہ کیا عالی شان خطاب ہوگا، کیا پُر تاثیر بیان ہوگا، ابن الجوزیؒ کہتے ہیں کہ اسی وقت میں نے اللہ سے وعدہ کیا کہ: اے اللہ! میں گنہ گار ہوں، جنت تو مجھے نہیں مل سکتی، میرے اعمال اس لائق نہیں، اور مجھے جہنم میں ہی جانا ہے، اس لئے صرف ایک درخواست یہ کرتا ہوں کہ مجھے ان دس ہزار کے سامنے عذاب نہ دینا، ان سے اوجھل رکھ کر جہنم میں ڈالنا۔

اللہ اکبر! کیا عاجزی ہے، کیا تواضع ہے، میں نے ایک سفر کے دوران ابن الجوزی کی یہ بات پڑھی اور یہ واقعہ پڑھ کر میرا سر کچھ دیر کے لئے چکرانے لگا، واقعی یہ حضرات اپنے غایت تواضع وانتہائی عاجزی سے ہی اس قدر اونچے مراتب پر فائز ہوئے ہیں، میں کہتا ہوں کہ اس طریق کا حاصل یہی ہے کہ نیکی کرتا رہے اور پھر بھی ڈرتا رہے، گناہ کر کے ڈرنا کمال نہیں، نیکیاں کر کے ڈرنا کمال ہے۔

بچوں کو نیک بنانے ماں باپ کا نیک ہونا ضروری ہے

ایک میاں بیوی نے عہد کیا کہ ہم صحیح اور نیک زندگی گزاریں گے، اور کوئی کام خلاف شرع نہیں کریں گے، تا کہ ہمارے بچے پر اچھے اثرات مرتب ہوں، چنانچہ ان دونوں نے صحیح طریقہ پر اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز کیا، اور احتیاط کی زندگی گذارتے رہے، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ان کے بچہ نے اسکول میں دوسرے بچے کا کچھ سامان چوری کرلیا، تو استاذ نے ماں باپ کو اطلاع دی، ماں باپ گئے اور بچے کو تنبیہ کی، پھر گھر آ کر غور کرنے لگے، کہ ہم نے عہد کیا تھا نیک زندگی گزاریں گے، پھر بچے میں یہ چوری کا اثر کیسے ہوگیا؟ تو ماں نے کہا کہ اس میں غلطی میری ہے، کیونکہ ہمارے پڑوس کے گھر میں ایک بیر کا درخت ہے، جس کی ایک شاخ ہمارے گھر میں آئی تھی اور اس بچہ کا جب حمل مجھے تھا تو میں نے اس میں سے بغیر اجازت کے کچھ بیر کھالئے تھے، اسی چوری کا اثر بچے پر ہوا ہے۔

سورۃ فاتحہ درخواست ہے

چوں کہ انسان اللہ کے شایانِ شان درخواست پیش نہیں کرسکتا، اس لیے سورہ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے درخواست پیش کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی بھی یونیورسٹی میں، کسی بڑے ادارے میں، جامعہ و مدرسہ میں داخلہ فارم میں پہلے ہی سے درخواست کا مضمون لکھا ہوا ہوتا ہے، طالب علم کو صرف دستخط کرنا ہوتا ہے کہ اس میں جو کچھ لکھا ہوا ہے، مجھے منظور ہے، یہ اسی لیے ہے کہ آنے والا صحیح درخواست پیش نہیں کرسکتا، کچھ نہ کچھ گڑ بڑ کر دیتا ہے، اصول وقواعد کو نہیں جانتا، اس لئے پہلے سے ہی درخواست کا مضمون لکھ کر رکھ دیا جاتا ہے، اسی طرح سورہ فاتحہ

بھی درخواست ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے ہماری خاطر خود ہی بنا کر ہمیں دیدیا، ورنہ اللہ کے شایانِ شان کون مضمون بنا سکتا تھا؟ پھر جب بندہ نے درخواست پیش کی کہ اے اللہ؛ سیدھا راستہ بتا، تو اللہ نے اس کے جواب میں تیس پارے نازل کیے کہ یہ سارے احکامات ہیں، جن پر چلنے سے سیدھا راستہ ملے گا۔

انسان کی چار حالتیں

حضرات صوفیاء فرماتے ہیں کہ انسان پر چار حالات آتے ہیں: ایک حالتِ نعمت، دوسری حالتِ مصیبت، تیسری حالتِ طاعت اور چوتھی حالتِ معصیت۔ اور ہر وقت ہر انسان ان چار حالتوں میں سے دو حالات میں ضرور مبتلا رہتا ہے، اس لیے کہ انسان پر نعمت یا مصیبت میں سے کوئی ایک حالت ضرور ہوگی، اسی طرح معصیت یا طاعت میں سے کوئی ایک حالت ضرور ہوگی، اس طرح ہر انسان پر ہر وقت دو حالتیں رہیں گی، پھر ان چاروں حالات کے چار حق ہیں: نعمت کا حق شکر ہے، مصیبت کا حق صبر ہے، اور معصیت ہو تو استغفار یعنی توبہ، اور طاعت ہو تو استبشار یعنی خوش ہونا۔ اور حدیث میں اس کی طرف اشارہ ہے، اللہ کے رسول ﷺ اپنی دعاء میں یہ بھی کہا کرتے تھے کہ: " اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنَ الَّذِیْنَ اِذَا اَحْسَنُوْا اسْتَبْشَرُوْا وَاِذَا اَسَاءُ وْ ا اسْتَغْفَرُوْا" (اے اللہ! ہمیں ان لوگوں میں سے بنادے جو نیکیاں کرتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں، اور ان سے برائی ہو جاتی ہے تو استغفار کرتے ہیں) (ابن ماجہ: ۳۸۱۰، احمد: ۱۲۲۲۲)

شکر گذار فقیر افضل ہے

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے پوچھا گیا کہ حضرتمت لدار شکر گذار افضل

ہے یا فقیر صابر افضل ہے؟ فرمایا: ان میں سے کوئی بھی افضل نہیں، بلکہ شکر گذار فقیر افضل ہے کہ مصیبت آئی تب بھی شکر کر رہا ہے، میں اس کی مثال دیتا ہوں، جیسے کوئی بیمار ہوا، ڈاکٹر نے کہا آپریشن کرنا ہوگا، اور پیسے بھی دینے پڑیں گے، مریض نے ڈاکٹر سے آپریشن بھی کرایا اور پھر باادب روپئے بھی دیئے، اور اس پر ڈاکٹر کا شکریہ بھی ادا کیا، یہاں کوئی مریض یہ نہیں کہتا کہ ڈاکٹر صاحب! آپ نے میرا جو آپریشن کیا، اس پر میں آپ کا کوئی شکوہ نہیں کرتا، بلکہ اس پر میں صبر کرتا ہوں، بلکہ یہ کہے گا کہ آپ کا شکریہ کہ آپ نے میرا علاج کر دیا اور میرے اوپر آپ نے احسان فرمایا، جب دنیا کا ادنیٰ ڈاکٹر جس کی طرف سے یہ بھی امکان ہے کہ غلط کر ڈالے اور یہ بھی امکان ہے کہ اپنی غرض کے لئے آپریشن کرتا ہو، جب وہ ہمیں تکلیف و مصیبت دے رہا ہے، اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں ہمارا فائدہ اور مصلحت ہے، تو ہم اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں، تو حقیقی ڈاکٹر اللہ تعالیٰ کوئی بیماری ہمارے ہی فائدہ کے لیے دیتا ہے، تو کیا شکر نہیں کیا جا سکتا؟ اور وہ ہماری مصلحت کے لئے کبھی فقر و فاقہ دے تو کیا اس پر اس کا شکر نہیں ہو سکتا؟ بے شک، ہو سکتا ہے، اس لیے فقیرِ شاکر افضل سب سے ہے۔

نرا خوف شیطان کو بھی حاصل تھا

خوفِ خدا سے مقصود یہ ہے کہ آدمی معاصی اور گناہوں سے بچے، اگر خوف کے ذریعہ گناہوں سے نہیں بچتا تو ایسا خوف شیطانی خوف ہے۔ قرآن میں ہے کہ:

كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ، فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّیْ بَرِیْءٌ مِّنْكَ اِنِّیْ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ. (سورۂ حشر: ۱۶)

جیسے شیطان انسان سے کہتا ہے کہ کفر کر اور جب وہ کفر کر لیتا ہے تو کہتا ہے کہ میں تجھ سے بری ہوں اور میں اللہ رب العالمین سے خوف کرتا ہوں۔

دیکھئے شیطان خود کہہ رہا ہے کہ وہ اللہ سے خوف کرتا ہے، مگر کیا یہ خوف اس کا معتبر ہوگا؟ ہرگز نہیں، کیوں کہ اس خوف کے ساتھ گناہ سے بچنا اور پرہیز کرنا نہیں پایا گیا، اس لئے خوف وہ معتبر ہے جو گناہ سے بچائے۔

اس پر مجھے ایک بات یاد آگئی کہ ایک مرتبہ جناب مقصود علی خان صاحب مرحوم، مدیر اعلی روزنامہ سالار، بنگلور، میرے پاس آئے، اور وقتاً فوقتاً بڑی محبت سے میرے پاس آتے رہتے تھے، اور جب بھی کوئی اشکال پیش آتا تو فون سے یا خود تشریف لاکر معلومات کرتے تھے، اسی طرح ایک بار آئے اور کہا کہ مولانا! قرآن پڑھ رہا تھا، ایک آیت پڑھتے ہوئے ٹھٹک گیا، پھر یہی آیت پڑھی: اِنِّیْ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ اور کہنے لگے کہ شیطان کو جب خوفِ خدا حاصل ہے تو اس کی بخشش کیوں نہ ہوگی؟ یہ شبہ دل میں آگیا، اور پریشان ہوکر آیا ہوں کہ اس کا جواب معلوم کروں، میں نے یہی عرض کیا کہ بخشش جس خوف پر ہے وہ ایسا خوف ہے جو انسان کو معاصی سے روکے، مطلق خوف کی کوئی فضیلت نہیں، اس پر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ یہ بات مجھے معلوم نہ ہونے کی وجہ سے بہت پریشان تھا، اور طرح طرح کے شبہات دل میں آتے تھے۔

الغرض اس سے یہ بات اور بھی واضح ہوگئی کہ اللہ کا خوف اس لئے مطلوب ہے کہ اس سے گناہوں سے بچنے کی قوت حاصل ہوتی ہے، اور اگر خوف تو ہو اور وہ گناہ سے نہ بچائے تو ایسا خوف اللہ کے نزدیک نہ مطلوب ہے نہ محمود ہے، اسی لئے نبی کریم ﷺ نے ایک دعاء میں فرمایا کہ:

اللّٰھم اقسم لنا من خشیتک ما یحول بیننا و بین معاصیک

کہ اے اللہ! ہمیں تیرے خوف میں سے اتنا حصہ عطا فرما جو ہمارے اور تیرے گناہوں کے درمیان آڑ بن جائے۔ (ترمذی:۳۴۲۴)

معلوم ہوا کہ خوف کی ضرورت اس لئے ہے کہ آدمی اللہ سے ڈر کر گناہوں سے باز آ جائے۔

ایک سوال کا جواب

پوچھا گیا کہ حضرت! یہ کیسے معلوم ہو کہ خدا کی محبت ہمارے دل میں پیدا ہو چکی ہے؟ فرمایا: جب انسان انسان سے محبت کرتا ہے تو کیا معلوم نہیں ہوتا؟ معلوم ہوتا ہے کہ دل کا میلان اسکی طرف زیادہ ہے، اسی کی فکر میں لگا ہوا ہے، یہ علامت ہے کہ کسی سے اس کو محبت ہوگئی ہے، اسی طرح جب اللہ سے محبت پیدا ہوگی تو ہمیشہ ذکر میں رہے گا، فکر میں رہے گا، دنیا کے دھندوں سے دور رہے گا، اور اگر دنیا کے دھندوں میں رہے گا تب بھی اس کا دل اللہ کی طرف ہوگا، جیسے قرآن میں ہے:

رِجَالٌ لَّا تُلۡهِيۡهِمۡ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيۡعٌ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ

کہ کچھ لوگ وہ ہیں جن کو اللہ کے ذکر سے نہ تجارت غافل کرتی ہے اور نہ خرید وفروخت غافل کرتی ہے)۔ (سورۃ النور:۳۴)

اور جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: (سات آدمی قیامت کے دن عرش کے سایہ میں ہوں گے، ان میں سے ایک وہ شخص جس کا دل مسجد میں لٹکا رہتا ہے)۔

(بخاری:۶۲۰، ترمذی:۲۳۱۳)

یعنی وہ دنیا کے تمام کام کریگا، مگر اس کا دل اللہ کی طرف ہوگا، ہمیشہ اسی

کا استحضار رہے گا، اذان ہو تو فوراً مسجد کی طرف لپکے گا، ان علامات سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اس کو اللہ سے محبت ہوگئی ہے۔ حضرت خواجہ مجذوبؒ نے اسی کو اس شعر میں کہا ہے:

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی ‏ اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

اللہ والا بننے کے لئے دنیا چھوڑنا ضروری نہیں

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ والا بننے کے لیے تجارت، بیوی، بچے، سب کچھ چھوڑنا ضروری ہے، یہ غلط بات ہے، شیطانی وسوسہ اور دھوکہ ہے، بلکہ اگر آپ تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ صحابۂ کرام تجارت بھی کرتے تھے، ملازمت بھی کرتے تھے، بیویوں کے حقوق بھی ادا کرتے تھے، بچوں کی دیکھ ریکھ بھی کرتے تھے، پھر بھی سب سے بڑے اللہ والے تھے، ان سے بڑا اللہ والا اور کون ہو سکتا ہے؟ اور مذہب اسلام بھی یہی تعلیم دیتا ہے کہ کاروبار اور تمام کام کرتے ہوئے تم اللہ والے بن کر رہو، اور سب کے حقوق ادا کرو، اور یہی ذریعہ ہے اللہ تک پہنچنے کا، اس کے برخلاف اگر کوئی اپنے اہل وعیال کے، ماں باپ کے پڑوسیوں کے، اور رشتہ داروں کے حقوق ادا نہ کرے تو وہ حقیقی اللہ والا ہی نہیں۔

چناں چہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ کچھ لوگ ﷺ کے گھر آکر ازواج مطہرات سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے متعلق دریافت کرنے لگے، جب ان کو آپ کی زندگی کا اصول وطریقہ بتایا گیا، کہ آپ نماز بھی پڑھتے ہیں اور کبھی آرام بھی کرتے ہیں، کبھی روزے رکھتے ہیں اور کبھی افطار کرتے ہیں، نیز آپ اپنی بیویوں اور بچوں کے ساتھ رہتے ہیں، تو انہوں نے اس کو بہت کم شمار کیا اور کہنے لگے کہ آپ ﷺ کی بات تو دوسری ہے، اس لئے کہ آپ ﷺ بخشے بخشائے ہیں، پھر ان میں سے

ایک کہنے لگا کہ میں ہمیشہ رات بھر نماز پڑھوں گا، دوسرے نے کہا میں صوم دھر رکھوں گا (بالکل افطار نہیں کروں گا)، تیسرے نے کہا: میں عورتوں سے الگ رہوں گا، شادی نہیں کروں گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا: خدا کی قسم میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور تم سے بڑا متقی ہوں، لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں، افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں، سوتا بھی ہوں، شادی بھی کرتا ہوں، پس جو میرے طریقہ سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں ہے۔

(بخاری: ۵۰۶۳، مسلم: ۲۴۸۷)

اس حدیث میں بڑی عبرت ہے، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُس الاولیاء ہونے کے باوجود دنیوی سارے کام انجام دیتے تھے، تمام کے حقوق ادا کرتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ والا بننے کے لئے راہب بننا ضروری نہیں، بلکہ جائز بھی نہیں۔

اسی لئے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ والا بننا دنیا چھوڑنے سے ہی ہوتا ہے، یہ غلط ہے، اصل یہ ہے کہ محنت وکوشش کی جائے احکام الٰہی پر چلنے کی، یہی اللہ والا بننا ہے۔ ورنہ تو بعض لوگ دنیا چھوڑ کر بھی اللہ والے نہیں بنتے، مثلاً بعض لوگ مدرسہ کے ماحول میں جو دینی، اصلاحی ماحول ہوتا ہے، رات دن قال اللہ وقال الرسول ہوتا ہے، اس کے باوجود بعض طلبہ ہیں، جو نماز تک نہیں پڑھتے۔

معلوم ہوا اللہ والا بننے کے لئے اصل فکر وتڑپ ہے، آپ سب کچھ کرتے ہوئے بھی اگر تڑپ وفکر ہو، تو اللہ والے بن سکتے ہیں، دنیا کے جھمیلے ومصروفیات آپ کو اللہ والا بننے سے نہیں روک سکتے۔

ہم تو سنار تھے لوگوں نے لوہار سمجھ لیا

ایک مرتبہ مجلس میں حضرت والا نے فرمایا: میں ایک مرتبہ میرے شیخ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب کے پاس بیٹھا ہوا تھا، ایک آدمی آیا اور تعویذ مانگنے لگا، حضرت نے کہا کہ جاؤ بھائی جان سے لے لو، (بھائی جان سے مراد حضرت والا کے صاحبزادہ ہیں جن کو طلباء اور عوام سب بھائی جان کہتے ہیں)، وہ شخص باہر گیا، پھر تھوڑی دیر بعد آکر کہنے لگا، حضرت! آپ ہی دیدیجئے، حضرت والاؒ نے پھر فرمایا کہ: بھائی جان سے لے لو، میں تعویذ دیا نہیں کرتا، وہ شخص پھر باہر گیا، اور کچھ دیر کے بعد پھر آکر اسی طرح کہا کہ حضرت! تعویذ آپ ہی دیدیجئے، حضرت نے پھر وہی جواب دیا، اور بھیج دیا، اور میری طرف دیکھ کر فرمانے لگے: ہم تو سنار تھے، لوگوں نے ہمیں لوہار سمجھ لیا، یعنی کوئی سنار کے پاس لوہے کا کچھ کام بنانے لے جائے تو یہ وضع الشیء فی غیر محلّہ کی قبیل سے ہوگا، اسی طرح آج لوگ اللہ والوں کے پاس بجائے اپنی اصلاح کرانے کے اور معرفت الٰہی حاصل کرنے کے، دینی باتیں معلوم کرنے کے، وصول الی اللہ کے طرق معلوم کرنے کے، تعویذ کے بارے میں پوچھنے جاتے ہیں، دنیا کے بارے میں معلوم کرنے جاتے ہیں کہ حضرت میرا فلاں کام رک گیا ہے، حل کر دیجئے وغیرہ وغیرہ۔

خوفِ خدا کی فضیلت

اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ خوف کے فضائل بیان فرمائے ہیں، اور ایک جگہ اس کی ضرورت اور اس پر مرتب ہونے والے ثمرہ کا ذکر فرمایا ہے، میں پہلے آپ کو وہ آیت سناتا ہوں جو سورۂ نازعات میں اللہ نے ذکر فرمائی ہیں:

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى. (النازعات ۴۰:)

ترجمہ: جوآدمی اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کھاتا ہے اور اپنے نفس کو گناہوں سے بچاتا ہے تو اس کے لئے جنت ٹھکانہ بنادی جاتی ہے) معلوم ہوا کہ خوفِ خدا وہ چیز ہے جس پر اللہ کی جانب سے جنت کا وعدہ کیا گیا ہے، کیا یہ کوئی معمولی بات ہے کہ آدمی کو جنت مل جائے؟

محترم حضرات! یہ بشارت عظیم ترین بشارت ہے، ہرآدمی کی یہ خواہش ہے کہ وہ جنت میں جائے، کوئی یہ نہیں چاہتا کہ وہ جہنم میں جائے، جہنم انتہائی خطرناک چیز ہے، مومن کی کیا مجال کہ وہ اس بات کی خواہش کرے کہ وہ جہنم رسید کردیا جائے؟ بلکہ ہرمومن اپنے دل میں اس بات کی خواہش رکھتا ہے کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے حتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کے اندر اس بات کی دعا کی ہے:

اللّٰهم انّى أسئلک الجنة وما قرب اليهامن قول أو عمل، و أعوذبک من النار وما قرب اليهامن قول أوعمل .

اے اللہ! میں تجھ سے جنت مانگتا ہوں اور اس چیز کا سوال کرتا ہوں جو مجھے جنت کے قریب کرنے والی ہو، خواہ عمل میں سے ہو یا قول میں سے ہو۔

(ابوداؤد:۱۲۶۵، مسنداحمد:۱۴۰۲)

جوطرز زندگی جنت کے قریب کرنے والی ہو، اللہ سے اس کو مانگا جارہا ہے کہ مجھ کو وہ عمل عطاء فرما، اور اے اللہ! میں دوزخ سے پناہ چاہتا ہوں اور اس کے ساتھ اس چیز سے بھی پناہ مانگتا ہوں جو جہنم کے قریب کرنے والی ہو، جو عقائد، جو اعمال، اور جو طرز زندگی مجھے جہنم کے قریب لے جانے والی ہو، اس سے بھی پناہ مانگتا

ہوں۔

الغرض جنت کی خواہش ہر مومن کے دل کی آواز ہے اور جہنم سے بچنا بھی اس کے دل کی آواز ہے، لیکن اس کا طریقہ کیا ہو؟ طریقہ یہی ہے جو قرآن نے بتایا:

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى

اللہ کے سامنے جوابدہی کا خوف کہ مجھ سے پوچھا جائے گا اور سوال کیا جائے گا اور مجھے اس کا جواب دینا ہوگا، جب آدمی کے دل میں اس بات کا خوف آئے گا، وہ گناہوں سے اپنے آپ کو بچائے گا، اور جو ایسا کرے گا اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔

حضرت مولانا اسد اللہ صاحبؒ کی تواضع

ایک واقعہ سناتا ہوں، ہمارے زمانے کے ایک بزرگ ہیں، حضرت مولانا اسد اللہ خان صاحب، جو حضرت تھانویؒ کے خلیفہ تھے، اور ان کے خلیفہ حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندویؒ اور حضرت اقدس مفتی مظفر حسین صاحبؒ ہیں، ان کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ وہ عمدہ اور نئے کپڑے پہن کر کہیں جا رہے تھے، راستہ میں ایک جھاڑو دینے والی جھاڑ رہی تھی، حضرت کے اوپر کچھ دھول وغیرہ لگ گئی، اور کپڑے کچھ میلے ہو گئے اور حضرت بھی بڑے نظیف ولطیف مزاج انسان تھے، کئی کئی مرتبہ وضو کرتے تھے، جب پوچھا گیا، تو فرمایا کہ دل کو سکون نہیں ہوتا، چنانچہ اس دھول وغیرہ کی وجہ سے اس جھاڑنے والی کو ڈانٹ دیا، اور کہا کہ تجھے جھاڑو دینا بھی نہیں آتا، میرے کپڑے میلے اور گندے کر دیئے، یہ کہہ کر اپنی جگہ پر آ گئے، جب اپنی جگہ بیٹھے تو دل بے چین ہوتا ہے، بے قراری

پیدا ہوتی ہے، طلبہ کو بلاتے ہیں، خدام کو آواز دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ دیکھو بھائی؛ جھاڑو دینے والی کہاں ہے، اس کو بلا کر لے آؤ،سب خدام ادھر ادھر بکھر گئے اور تلاش کرنے لگے،مگر وہ ملی ہی نہیں،طلبہ نے آکر کہا کہ حضرت! وہ تو نہیں ملی،تو حضرت بے چین ہو گئے،فوراً اٹھے اور خود اس کو تلاش کرنے لگے،وہ کسی سڑک پر جھاڑو دے رہی تھی،آپ اس کے پاس تشریف لے گئے اور اس سے کہا کہ میں نے تجھے ڈانٹ دیا تھا، مجھے خدا کے لیے معاف کر دینا، مجھے حق نہیں کہ میں تجھے ڈانٹوں۔

امام شافعی کا ایک واقعہ

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ بادشاہ ہارون رشید کا دربار تھا،اس کی مجلس میں مذاکرہ ہو رہا تھا، اور بڑے بڑے علماء وہاں موجود تھے،امام شافعی اس وقت چھوٹی عمر کے تھے،لیکن بڑے شوق کے ساتھ اس مجلس میں جا کر بیٹھ گئے، ہارون رشید نے لوگوں سے سوال کیا کہ تم لوگ جو بڑے علماء ہو، بڑے بڑے مشائخ ہو،قران وحدیث کا علم رکھتے ہو،میرے بارے میں بتاؤ کہ میں جنت میں جاؤں گا یا دوزخ میں جاؤں گا؟لوگوں نے کہا:اس کا جواب ہم کیسے دے سکتے ہیں؟ قران سے مسئلہ تو بتا سکتے ہیں،لیکن کسی کی قسمت کا فیصلہ نہیں بتا سکتے، ہاں احکام بتائے جا سکتے ہیں، زندگی میں انسان کو کس رنگ سے کس ڈھنگ سے رہنا چاہیے، اللہ تعالیٰ کس چیز سے راضی ہوتا ہے اور کس سے ناراض ہوتا ہے، یہ تو بتا سکتے ہیں،لیکن یہ سوال کہ ایک آدمی جنت میں جائے گا یا دوزخ میں جائے گا؟ یہ تو غیب کی بات ہے،کسی انسان کے بارے میں قران وحدیث کا جاننے والا غیب کی بات کیسے بیان کر سکتا ہے؟

امام شافعی جوابھی نوعمر تھے، انھوں نے عرض کیا کہ حضور! اگر اجازت ہوتو میں اس کا جواب دے سکتا ہوں، بادشاہ نے کہا کہ ضرور دیجئے، اللہ تعالے نے امام شافعی کو بڑی بصیرت اور فراست سے نوازا تھا، امام شافعی نے کہا کہ حضور! آپ تو سوال کرنے والے ہیں اور میں جواب دینے والا ہوں، آپ اوپر بیٹھے ہیں اور میں نیچے بیٹھا ہوں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اس لئے آپ نیچے اتر آیئے اور مجھے اوپر بٹھا دیجئے۔ (یہ اولیاءاللہ جو ہوتے ہیں کسی سے ڈرتے نہیں ہیں، بادشاہ ہوتو کیا ہوا؟ اس لئے کہ جو اَللّٰہُ اَکْبَر کی رٹ دن رات لگا تا ہو، ہر وقت اس کی زبان پر اللّٰہُ اکبر کا نعرہ ہو اور دل میں اس حقیقت کو جمالیا ہو کہ اللہ سے بڑا کوئی نہیں ہے، وہ کسی کو بڑا سمجھ ہی نہیں سکتا) امام شافعی کہنے لگے کہ آپ سائل ہیں اور میں مجیب ہوں، جواب دینے والے کا مقام اونچا ہوتا ہے، سوال کرنے والے کا مقام چھوٹا ہوتا ہے، اس لئے آپ کو نیچے ہونا چاہئے، بادشاہ نے اس چھوٹے سے بچے کی یہ گفتگو سنی اور کہا کہ اس بچے کو اوپر بٹھا دو اور ہمارے لئے نیچے انتظام کر دو، امام شافعی کو اوپر تخت پر بٹھا دیا گیا اور بادشاہ نیچے اتر گیا، امام شافعی نے کہا کہ اب آپ اپنا سوال پیش کریں؟ جب سوال پیش کیا تو امام شافعی نے کہا کہ میں ایک سوال آپ سے کرتا ہوں، آپ بتائیں کہ کیا زندگی میں کبھی ایسا ہوا ہے کہ اللہ کے خوف سے آپ گناہوں سے بچ گئے ہوں، اور وہاں گناہ کرنے سے کوئی چیز مانع بھی نہیں رہی ہو، جو جی چاہے آپ کر سکتے ہوں، لیکن محض اللہ کے خوف اور ڈر کی وجہ سے آپ نے گناہ کو چھوڑ دیا ہو، کبھی ایسی نوبت آپ کو آئی ہے؟ بادشاہ نے کہا کہ ہاں بسا اوقات ہوا ہے، کوئی روک ٹوک نہیں تھی، کوئی دیکھنے والا تک نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود میں نے گناہوں سے اپنے آپ کو بچایا ہے کہ

کوئی تو مجھکو نہیں دیکھ رہا ہے، لیکن اللہ مجھ کو دیکھ رہا ہے۔ اس پر امام شافعی نے فرمایا کہ اب میں آپ کے سوال کا جواب دیتا ہوں کہ آپ ان شاء اللہ جنتی ہیں، لوگوں نے کہا کہ آپ یہ بات کس بنیاد پر فرمارہے ہیں اور اس کی کیا دلیل ہے؟ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی آیت تلاوت کی:

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى

جو آدمی اللہ کے خوف سے ڈر گیا اور اللہ کے خوف کی وجہ سے گناہوں سے بچ گیا تو جنت میں اس کا ٹھکانہ بنا دیا جاتا ہے۔ امام شافعی نے کہا: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان شاء اللہ جنتی ہیں۔

معلوم ہوا بھائیو! اللہ کا خوف اتنی قیمتی چیز ہے، اتنی بھاری چیز اور عظیم الشان چیز ہے کہ جس آدمی کے دل میں اللہ کا خوف آجاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا فیصلہ لکھ دیتے ہیں۔

ایک عبرت آموز حدیث

خوفِ خدا کی ایک فضیلت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس شخص کی مغفرت کر دی جاتی ہے، جس کے دل میں اللہ کا خوف ہوتا ہے میں آپ کو ایک حدیث سناتا ہوں، جس کو امام منذریؒ نے الترغیب والترہیب میں روایت کیا ہے۔

وہ یہ کہ حضرت نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل میں ایک آدمی کفل نام کا تھا، جو ہر قسم کی برائی میں طاق تھا اور ہر برائی کیا کرتا تھا، ایک دن اس کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے اس سے کہا کہ اگر تم مجھے اتنے روپئے دیدو، تو میں اپنے آپ کو تمہارے حوالے کر دوں گی، اور تم کو مجھ سے اپنی خواہش پوری کرنے کا حق

ہوگا، وہ شخص پہلے ہی سے برائی کا عادی تھا، اسے یہ موقعہ غنیمت نظر آیا اور اس نے اس عورت کو رقم دینے کا وعدہ کرلیا، اور اس سے اپنی نفسانی خواہش پوری کرنے کے لئے کسی کمرے میں لے گیا، جب برائی کا وقت آیا تو وہ عورت کانپنے لگی اور اس پر خوف و دہشت طاری ہوگئی، اس نے اس عورت سے پوچھا کہ تو کیوں خوف زدہ ہے اور کانپ رہی ہے؟ وہ کہنے لگی کہ میں نے میری پوری زندگی میں کبھی یہ حرکت نہیں کی، اور آج مجھے اس حرام و ناجائز کام کو اس لئے کرنا پڑ رہا ہے کہ میرے بچے گھر میں بھوکے پیاسے ہیں اور ان کا کوئی کفیل نہیں ہے، اور پکانے کا کوئی سامان نہیں، میں انتہائی مجبور ہوکر سوچنے لگی کہ کیا کرسکتی ہوں، تو میرے ذہن میں آیا کہ میں اپنے آپ کو کسی کے حوالے کر کے اور اپنی عصمت اور اپنی پاکدامنی کو بیچ کر اس سے جو کچھ روپئے حاصل ہوجائیں، اس سے بچوں کی پرورش کروں، تو ان کی ضرورت اور ان کے کھانے کا نظام کرنے کے لئے میں نے اس برائی کا ارادہ کیا، مگر مجھے اللہ کا خوف ہورہا ہے اور اس لئے مجھ پر کپکپی طاری ہے۔

عورت دل سے کہہ رہی تھی، تو اس کی بات دل پر اثر انداز ہوئی، اور عورت کی یہ داستان سن کر اور اس کا اللہ سے یہ خوف دیکھ کر، اس مرد کے دل میں بھی اللہ کا ڈر اور خوف پیدا ہوگیا، اور کہنے لگا کہ تو صرف ایک بار گناہ کا صرف ارادہ کر کے، اللہ سے اس قدر خوف کررہی ہے، اور میرا حال یہ ہے کہ میں نے پوری زندگی اس کی نافرمانی میں اور معصیت میں گزاری ہے، مجھے اللہ کا تجھ سے زیادہ خوف کرنا چاہیئے، اس لئے میں توبہ کرتا ہوں کہ آج سے کبھی گناہ نہیں کروں گا، اور میں نے جو تجھ سے رقم دینے کا وعدہ کیا ہے، وہ بھی تجھ کو دوں گا۔ اب اس نے اس عورت کو وہ رقم بھی دے دی اور برائی سے توبہ بھی کرلی، اس عورت کو بڑی

خوشی ہوئی کہ ایک آدمی کو اس کی طرف سے ہدایت ملی ، دیکھئے ایک عورت اگر ہدایت کے راستہ پر لانا چاہے، تو بڑے بڑے بدکاروں کو بھی ہدایت پر لے آئے۔

غرض وہ عورت وہاں سے واپس ہوگئی اور یہ آدمی اس کے جانے کے بعد ندامت کے ساتھ اللہ کے سامنے روکر، گڑگڑا کر، اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا اور اسی حالت میں اسی رات اس کا انتقال ہوگیا، بنی اسرائیل میں اللہ تعالی کی ایک سنت جاری تھی کہ جو آدمی اچھا ہوتا، اس کی اچھائی کا ذکر قدرت سے اس کے دروازہ پر لکھ دیا جاتا اور اگر کوئی برائی کرتا تو اس کے دروازہ پر اس کی برائی کا ذکر کر دیا جاتا تھا اور یہ کفل نامی شخص تو اتنا برا کہ اس کے دروازے پر روزانہ کچھ نہ کچھ اس کی برائی لکھی ہوئی ہوتی تھی کہ آج اس نے زنا کیا ہے، اور آج اس نے شراب پی ہے، یا اور کوئی برائی کی ہے، سارے شہر میں اس کی رسوائی ہوتی اور سب لوگ کہتے تھے کہ یہ کیسا برا آدمی ہے اور لوگ اسی وجہ سے اس سے ڈرتے اور دور رہتے تھے۔

نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ رات کو اس کا انتقال ہوگیا، اور صبح لوگ اٹھکر دیکھتے ہیں کہ اس کے دروازے پر لکھا ہوا ہے کہ " **قد غفر الله للكفل**" اللہ تعالیٰ نے کفل کی مغفرت کر دی اور لوگ پڑھتے ہوئے جارہے تھے، گذرنے والے روزانہ دیکھا کرتے تھے کہ اس کے دروازے پر کبھی کچھ برائی تو کبھی کچھ اور برائی لکھی ہوتی تھی، مگر آج عجیب حالت ہے کہ اللہ نے کفل کی مغفرت کر دی، لوگ کہنے لگے کہ آج اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوا کہ اتنا بُرا آدمی، اتنا شریر و فاسق آدمی، اور اللہ نے اس کی مغفرت کر دی! جب لوگوں نے تحقیق کی تو اس عورت کا واقعہ معلوم ہوا، خود عورت نے آکر بتایا کہ رات ایسا ایسا واقعہ ہوا تھا، تب لوگوں کو سمجھ میں آیا کہ اللہ نے اسی لئے اس

کی مغفرت کردی۔ (الترغیب والترھیب:۲۵۸/۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک خوف اور ڈر اور اس کی بنا پر گناہوں سے پرہیز بڑی مبارک چیز ہے۔

ایک عظیم علم اور نکتہ

یہاں ایک بات سمجھ لیں کہ اللہ تعالے نے خوف کے بارے میں فرمایا ہے:

''وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى''

جو اللہ کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کرے اور اس کے نتیجہ میں نفسانی خواہشات سے رک جائے۔

اس میں ایک عظیم علم اور نکتہ ہے، وہ یہ کہ اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ اللہ کے سامنے جانے کا، اللہ کے سامنے کھڑے ہونے کا، اللہ کے سامنے جا کر بیان دینے کا اور اپنے گناہوں کے سلسلہ میں جو سوال ہوگا، اس کے جواب دینے کے بارے میں جو آدمی اللہ سے ڈرتا ہے، اللہ تعالی اس کو جنت میں ٹھکانہ عطاء فرماتے ہیں، اس لئے آدمی کو ایک طرف اپنے گناہوں کا خیال کرنا چاہئے کہ مجھ سے گناہ تو نہیں ہو رہے ہیں؟ اگر ہو رہے ہیں تو سب سے پہلا کام یہ ہے کہ معافی طلب کرے، اور دوسرے نمبر پر یہ کہ اللہ کا ڈر اپنے دل کے اندر پیدا کر کے اس سے بچنے کی پوری کوشش کرے۔ جو شخص اللہ کے ڈر کے مارے گناہوں سے بچے گا، اللہ اس کو ضرور جنت میں داخل کرے گا۔

آج اللہ کا ڈر لوگوں کے قلوب سے نکل گیا، اس کی وجہ سے بے تحاشا گناہ کرتے چلے جا رہے ہیں، ان کو خیال تک نہیں آتا کہ اللہ کے سامنے جانا ہے اور حاضری دینا ہے، اور وہاں سوال وجواب ہوگا، بغیر کسی پردے کے، بغیر کسی

درمیانی چیز کے، اللہ تعالی براہ راست سوال کرے گا، اور ہمیں وہاں اس کا جواب دینا ہوگا، یہ نہیں کہ درمیان میں کوئی فرشتہ ہوتا ہو، اور ادھر سے اللہ پوچھتا ہو اور ادھر سے جواب لے کر کوئی فرشتہ اللہ کو بتاتا ہو، بلکہ حدیث پاک میں آتا کہ اللہ کے نبیصلی اللہ علیہ وسلمنے فرمایا: اللہ قیامت کے دن بغیر کسی ترجمان کے براہ راست سوال کرے گا۔

(بخاری شریف:۱۳۲۴، مسند احمد: ۱۷۵۳۵)

ذرا اندازہ کرو، اگر کسی بادشاہ کا محل ہو، وہاں پر اس کی فوج موجود ہو اور وہ پورے کرّ وفر کے ساتھ وہاں بیٹھا ہو، لاؤ لشکر اور ساری طاقت وہاں پر موجود ہو اور ہم کو مجرم بنا کر اس کے دربار میں لے جایا جائے، تو اس وقت ہماری کیا حالت ہوگی، اور کیا کیفیت ہوگی؟ ایک طرف شرم و حیاء، دوسری طرف ڈر و خوف پیدا ہوگا، جس کی وجہ سے ہمارا دل کانپ جائے گا، نیند اڑ جائے گی، چین ختم ہو جائے گا اور ہم یہ چاہیں گے کہ ہمیں زندہ رہ جانے کے بجائے موت آجائے تو کتنا اچھا ہو، اس لئے کہ اس قدر ذلت و رسوائی بادشاہ کے دربار میں مجرم بنا کر لے جایا گیا ہے، یہ کیسے برداشت ہوگی؟

بھائیو! جب دنیا کے بادشاہوں کا یہ حال ہے، تو سوچو کہ اللہ کے دربار کا کیا حال ہوگا؟ اس کے دربار میں، قیامت کے میدان میں دنیا کے پہلے انسان سے لیکر دنیا کے آخری انسان تک سب جمع ہوں گے اور اللہ کے فرشتے بھی وہاں جمع ہوں گے، دیگر مخلوقات بھی وہاں ہوں گی اور علی الاعلان حساب لیا جائے گا، ڈھانک کر اور چھپا کر نہیں لیا جائے گا، اور حساب پوری مخلوق کے سامنے آجائے گا۔

اب بتاؤ کہ کیا حال ہوگا؟ ایسے موقع پر اگر ہمارے سے سوال ہو اور جواب کا مطالبہ ہو، تو ہمارے پاس اس سوال کا کیا جواب ہوگا؟ اس لئے سب سے پہلے

آدمی کو ڈرنا چاہئے اللہ کے سامنے کھڑے ہونے سے، ''وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ '' کا مطلب یہی ہے کہ مجھے اللہ کے سامنے جانا ہے، کھڑا ہونا ہے، ایک ایک چیز کا حساب دینا ہے، اس کا خیال ہو۔

خوف اور محبت کی ایک عجیب مثال

یہاں ایک بات مزید عرض کرتا ہوں ، وہ یہ کہ کاروں ، بسوں اور دیگر سواریوں میں دو قسم کی طاقت ہوتی ہے، ایک سے کار کو آگے بڑھایا جاتا ہے، اور دوسری سے اس کو روکا جاتا ہے، اور یہ دونوں طاقتیں کار اور بس وغیرہ سب کے لئے ضروری ہیں، تا کہ یہ اپنی منزل تک پہنچ سکیں، اگر آگے لے جانے والی قوت نہ ہو تو یہ سواریاں چل نہ سکیں گی اور اگر روکنے کی قوت نہ ہو تو یہ سواریاں ہر وقت خطرہ کا شکار ہوتی رہیں گی، اسی روکنے کی قوت کو بریک کہا جاتا ہے، اب سمجھئے کہ اسی طرح انسان کو بھی اپنے روحانی وایمانی سفر کے لئے اور اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے دو قسم کی قوت چاہئے ، ایک نیکیوں کی راہ پر چلانے والی قوت اور دوسری گناہوں کے خطرات سے بچانے والی قوت ، نیکی پر چلانے کی قوت کا نام ہے محبت الٰہیہ ، اس طاقت سے انسان اپنے کو نیکی کی راہ پر چلا سکتا ہے، اللہ کی محبت وہ عجیب شئ ہے کہ ہزار تکالیف ہوں، مگر انسان اللہ کی محبت میں نیکی اور اطاعت کی راہ پر چلنے لگتا ہے۔

''از محبت تلخہا شیریں شود''

اور گناہوں کے خطرات سے بچانے والی قوت کا نام ہے خوف خداوندی، یہ اللہ کا خوف انسان کو گناہوں سے بچاتا ہے، اس لئے میں کہتا ہوں کہ خوف کی مثال ایسی ہے جیسے کار اور بس میں بریک ہوتا ہے کہ جب کوئی خطرہ کی بات سامنے آئے تو اس کا استعمال کیا جاتا ہے، کسی انسان کے سامنے کوئی گناہ کی بات آئے اور اس کو

اپیل کرے تو اس قوت کو استعمال کر کے ان ایمانی و روحانی خطرات سے بچنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

خوف کی دو قسمیں

ایک اہم نکتہ سن لیجئے، وہ یہ کہ علماء نے لکھا ہے کہ خوفِ خدا دو قسم کا ہوتا ہے، ایک یہ کہ بندے کے دل میں اللہ کی جلالت وعظمت کی طرف نظر کرتے ہوئے خوف پیدا ہو، اور دوسرا یہ کہ اللہ کی سزاؤں اور عذابوں اور اس کی طرف سے گناہوں پر بیان کی ہوئی وعیدوں پر نظر کرتے ہوئے خوف ہو۔

اگر چہ یہ دونوں قسم کے خوف معتبر ہیں اور ان دونوں پر اللہ کی طرف سے فضیلت ملے گی، مگر جو خوف صرف اللہ کی جلالت وعظمت کے پیشِ نظر ہو، اس کا درجہ بہت اونچا ہے، کیوں کہ یہ خوف کسی اپنی غرض کی بنا پر نہیں ہے بلکہ صرف اور صرف اللہ کی بڑائی و بزرگی کی وجہ سے ہے اور عارفین کا خوف اسی قسم کا ہوتا ہے۔

امام غزالی فرماتے ہیں کہ یہ اللہ کی عظمت وجلالت کی وجہ سے خوف کا ہونا، ایک بلند ترین مقام ہے اور یہ خالص موحدین وصدیقین کا مقام ہے۔

الغرض کوئی اللہ کا خوف اس لئے کرتا ہے کہ اللہ تعالے گناہ کی وجہ سے جہنم میں ڈالے گا اور سزا دیگا، تو یہ خوف بھی ٹھیک ہے اور اس پر بھی ثواب ہے، مگر اعلی و افضل مقام یہ ہے کہ اللہ کا خوف وڈر اس کی جلالت وعظمت اور اس کی صفات کا خیال کرتے ہوئے ہو اور اس سے بھی اعلی مقام یہ ہے کہ دونوں قسم کا خوف ہو، حضرات انبیاء اور صحابہ کرام واولیاء اللہ سے دونوں قسم کے خوف کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ حضرات ایک طرف اللہ کی جلالت وعظمت کا لحاظ کرتے ہوئے اس کا خوف کرتے تھے، تو دوسری طرف اس لئے بھی اللہ کا خوف کرتے تھے کہ اس کا عذاب اور اس کی سزا بھی

بڑی اور شدید ہے جس کا تحمل نہیں کیا جا سکتا۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا خوف

حدیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ کو اللہ کا اس قدر ڈر و خوف تھا کہ بسا اوقات تیز و تند ہوا چلتی یا کوئی سیلاب کی شکل ہو جاتی یا زور زور سے بارش آنے لگتی یا بجلیاں چمکتیں اور کڑکتیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلمکے دل پر اس کی وجہ سے ایک کیفیت طاری ہو جاتی، خدا کا ڈر اور خوف غالب آجاتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوڑ کر مسجد کی طرف جاتے اور اللہ کی عبادت میں لگ جاتے، بعض صحابہ کرام نے پوچھا کہ یا رسولصلی اللہ علیہ وسلم آپ اس قدر گھبراتے کیوں ہیں؟ اللہ کے نبیصلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے ڈر رہے کہ کہیں قیامت برپا نہ ہو جائے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، کیا بات ہے کہ آسمان پر جب بادل آجاتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ بدل جاتا ہے اور جب بارش ہو جاتی ہے تو آپ کی یہ کیفیت بدل جاتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عائشہ! مجھے یہ خوف ہوتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ قوم عاد کی طرح اللہ تعالی عذاب نازل فرما دیں کہ قوم عاد پر عذاب بادل کی شکل میں آیا تھا، انھوں نے یہ سمجھا کہ اب بارش ہونے والی ہے اور کہنے لگے" **هذا عارض ممطرنا** " کہ اب یہ بادل بارش برسائے گا، مگر اللہ نے اس کے ذریعہ ان پر پتھر برسا کر ان کو ہلاک کر دیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب بارش ہو جاتی ہے تو مجھے اطمینان ہو جاتا ہے کہ بارش ہو رہی ہے، اللہ کا عذاب نازل نہیں ہو رہا ہے۔

(بخاری: ۲۹۶۷، ابوداؤد: ۴۴۳۴)

ہماری بے خوفی وغفلت

حضرات! آج سخت ہواؤں کے جھکڑ چلتے ہوں،خوب بارش ہوتی ہو، سیلاب اورطوفان ہو یا سونامی جیسا کوئی واقعہ پیش آتا ہو،مختلف حوادثات پیش آتے ہوں، لیکن ہمارے دلوں پراس کا کوئی اثرنہیں ہوتا،یعنی ہم بے حس ہوگئے ہیں، گویا ہم کواطمینان ہوگیا ہے کہ ہمارے ساتھ کوئی معاملہ ہونے کا نہیں۔

یہ بے خوفی خطرناک ہے،قران کریم نے فرمایا کہ ذرا سوچواور دیکھو کہیں ایسا تونہیں کہ تم کواطمینان ہواوراللہ تمہارےاوپر پتھروں کی بارش نازل کردیں۔

أَمْ أَمِنتُم مَّنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ، أَمْ أَمِنتُم مَّنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ، فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرٌ. (الملک:۱۷)

حضرات! غور کیجئے کہ اللہ کے برگزیدہ نبی کو ہوااور بادل کی وجہ سے اللہ کا خوف ہورہا ہے اور ہم کوکوئی خوف نہیں ہوتا ، گناہ بھی جاری اور اطمینان بھی جاری ہے، گناہ بھی جاری ہےاور کھانا بھی جاری ہے، گناہ بھی جاری ہےاورسونا بھی جاری ہے، گناہ بھی جاری ہےاورتجارت بھی جاری ہے۔

خوف خدا بھی مانگنا چاہئے

اسی لئے اللہ سےاس کا خوف بھی مانگنا چاہئے ، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ سے خوف مانگتے تھے،ایک حدیث میں آپ کی یہ دعاءآئی ہے:

" اَللّٰھُم اقسم لنا من خشیتک ما تحول به بیننا وبین معاصیک"

اے اللہ! ہم کو اپنے خوف میں سے اتنا حصہ عطاء فرما جو ہمارے اور تیری نافرمانیوں کے درمیان آڑ بن جائے اور ہم گناہ نہ کرنے پائیں اور ایک حدیث میں فرمایا:

" اللھم اجعل حبّک احبّ الاشیاء الیّ واجعل خشیتک اخوف الاشیاء عندی " (الحزب الاعظم :لملا علی القاری)

اے اللہ! تو اپنی محبت میرے نزدیک تمام چیزوں سے زیادہ محبوب بنادے اور اپنا خوف وڈر تمام چیزوں سے زیادہ خوفناک بنادے۔

معلوم ہوا کہ اللہ سے اس کی بھی دعاء کرنا چاہئے کہ ہمیں اپنا خوف عطا فرمائے، کیونکہ جب آدمی کے دل میں اللہ کی جلالت وعظمت کی وجہ سے اس کا ڈر اور خوف آجاتا ہے یا وہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ میری حرکتوں پر اللہ کے یہاں پکڑ ہوگی تو اس کی وجہ سے وہ گناہوں سے ضرور بچے گا۔

آنحضرت ﷺ کا خوفِ خدا

ہمارے اسلاف کی سیرت کا اس لحاظ سے مطالعہ کریں کہ وہ کیسا خوف رکھتے تھے،اور آقائے نامدار تاجدار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ کریں، حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن شخیرؓ نے فرمایا کہ میں رسول اللہصلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کے سینہ میں رونے کی وجہ سے ایک آواز تھی، جیسے ہانڈی پکنے کی آواز ہوتی ہے،اور ایک روایت میں ہے کہ ایسی آواز تھی، جیسے چکی کی آواز ہوتی ہے۔

(نسائی:۱۱۹۹،ابوداؤد:۷۶۹،مسند احمد:۱۵۷۲۲)

یہ آواز دراصل خوف وخشیت کی بنا پر رونے کی وجہ سے تھی اور عام طور پر یہ

بات اس وقت ہوتی تھی جب کہ آپ نماز میں ہوتے تھے۔

حضور ﷺ پر خوفِ آخرت

حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ اللہ کے نبی ﷺ بہت بھوکے ہو گئے، کئی دن کا فاقہ تھا، یہاں تک کہ حضور ﷺ کو اس بے چینی اور اضطراب کی کیفیت نے گھر کے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا، اس وقت اللہ کے نبی ﷺ کی کیا کیفیت ہوگی؟ کیا حالت ہوگی؟ آج ہم لوگ کتنا کھاتے ہیں، کیسی کیسی نعمتیں ہم کو دی جاتی ہیں اور صرف کھانا ہی نہیں کھاتے، بلکہ پھل پھلاریاں اور مختلف چیزوں کا انتظام بھی ہوتا ہے، یہ ساری کیا اللہ کی نعمتیں نہیں ہیں؟ یہاں حضور ﷺ کا یہ معاملہ ہے کہ کئی دن گذر جاتے ہیں، کھانے کو کوئی چیز میسر نہیں، گھر کے اندر چولھا تک نہیں جلتا، جو کچھ کھجور وغیرہ اس طرح کی چیز مل جاتی، اسی کو کھا لیتے ہیں، پکانے کے لئے کوئی چیز میسر نہیں ہوتی تھی، الغرض حضور ﷺ بے چین و بے تاب ہوئے، دوپہر کا وقت تھا، ایک راستہ سے گذر رہے تھے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوگئی، حضور ﷺ نے ان سے پوچھا کہ دوپہری کے وقت باہر کیسے آنا ہوا؟ ابوبکر! کیا بات ہے، یہ وقت تو آرام کرنے کا ہے، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ بھوک برداشت نہیں کر سکا، اس لئے مجبور ہو کر باہر نکل آیا ہوں، حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس چیز نے تم کو باہر نکالا ہے، اسی چیز نے مجھے بھی باہر نکالا ہے، اب یہ دونوں حضرات مل کر آگے بڑھے، کچھ فاصلہ پر جانے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی، حضور ﷺ نے پوچھا: عمر! کیا بات ہے، دوپہر کی اس سخت گرمی میں باہر کیسے آنا ہوا؟ یہ تو آرام کا وقت ہے، حضرت عمرؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ کئی دن کا فاقہ ہے، آج بھوک برداشت نہیں ہوئی، اس

لئے باہر نکل آیا ہوں، یہ دونوں حضرات کہنے لگے کہ عمر! جس چیز نے تم کو باہر نکالا ہے، اسی نے ہم کو بھی باہر نکالا ہے، پھر یہ تینوں مقدس حضرات جن میں ایک تمام انبیاء کے امام تھے اور یہ دونوں صحابہ جن کی عظمتِ شان تمام لوگوں کو معلوم ہے، یہ تینوں حضرات ایک صحابی کے یہاں گئے، ان کا نام حضرت ابوالہیثم رضی اللہ عنہ تھا، حضرت ابوالہیثم رضی اللہ عنہ اس وقت وہاں موجود نہیں تھے، آپ نے ان کے بارے میں پوچھا، اسی درمیان وہ بھی آگئے اور ان کی تو عید ہوگئی کہ ان کے یہاں آج اللہ کے نبی تشریف رکھے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک جگہ بٹھایا اور جلدی جلدی کچھ انگور اور کچھ کھجور کے خوشے توڑ کر لائے اور آپ کے سامنے رکھ دیا، اور بکری ذبح کرنے چاقو اُٹھائی تو آپ نے فرمایا کہ دودھ والی کو ذبح نہ کرو، چناں چہ ایک بکری ذبح کی اور جلدی سے کچھ روٹیاں تیار کروائیں، اور سالن گوشت اور روٹی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لاکر رکھ دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان دونوں حضرات نے کھایا اور کھانے کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن تم ان نعمتوں کے بارے میں سوال کئے جاؤ گے، پھر سورہ تکاثر کی آیت تلاوت فرمائی: " **ثم لتسئلن یو مئذٍ عن النعیم** " کہ قیامت کے دن ان نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ کیا کیا کھائے تھے، کیا کیا مزے لوٹے تھے، ہم نے کیا کیا نعمتیں دی تھیں۔ (مسلم شریف: ۳۷۹۹، ترمذی شریف: ۲۲۹۲)

ایک اور موقعہ پر اسی طرح کا واقعہ پیش آیا اس میں آپ اور یہ دونوں حضرات، حضرت ابوایوب کے گھر تشریف لے گئے، انھوں نے کھانے کا انتظام کیا، آپ نے کھایا، پھر آپ کو رونا آ گیا، حتی کہ ہچکیاں آنے لگیں، اس منظر کو دیکھ کر صحابہ کو بھی رونا آ گیا، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یاد رکھو! جو کچھ کہ ہم نے کھایا ہے، اللہ کے سامنے قیامت کے دن اس کا حساب دینا ہوگا۔ (الدرالمنثور: ۶۵۱/۸)

اس کو کہتے ہیں اللہ کا ڈر اور اللہ کی خشیت، آج ہم کتنے اطمینان کے ساتھ اس کی نافرمانیاں کرتے ہیں جب کہ اللہ کے نبی ﷺ کی ذات وہ مقدس ترین ذات ہے، جن سے کسی گناہ کا صدور ناممکن ہے، محال ہے، آپ روتے ہیں اور گھبراتے ہیں۔

اس لئے نعمت استعمال کرنے کے بعد سوچو کہ اس کے بارے میں سوال ہوگا کہ اس کا استعمال تم نے کیسے کیا، حلال طریقہ سے کیا تھا یا حرام طریقہ سے کیا تھا؟ اور یہ کہ ہماری فرمانبرداری کے ساتھ کیا تھا یا نافرمانی کے ساتھ کیا تھا؟ اس سوال کا جواب جب تک نہ دیا جائے گا کوئی شخص اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتا، یہ تھا اللہ کے نبی کا خوف۔

حضرات صحابہ کا خوف

صحابہ کرام میں سے حضرت ابوبکر صدیقؓ و عمر بن خطابؓ یہ دونوں حضرات اپنے اندر بہت زیادہ اللہ کا خوف وڈر رکھتے تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کوئی پرندہ نظر پڑتا تو خوف کی وجہ سے فرماتے:

لیتنی مثلک یا طائر ولم اخلق بشرا.

کہ اے پرندے! کاش میں تجھ جیسا ہوتا، اور انسان بنا کر نہ پیدا کیا جاتا۔

اسی طرح حضرت ابوذ غفاریؓ سے مروی ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ اے کاش میں ایک درخت ہوتا کہ کاٹ دیا جاتا اور حضرت عثمانؓ فرمایا کرتے تھے کہ اے کاش میں مرنے کے بعد دوبارہ نہ اُٹھایا جاتا۔

حضرت ابن ابی ملیکہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے تیس صحابہ کو پایا ہے جو سب کے سب اپنے اوپر نفاق کا اندیشہ کیا کرتے تھے۔ (صحیح بخاری: کتاب الایمان)

اسی طرح حضرت عمرؓ کو اللہ کا اس قدر خوف تھا کہ اپنے اوپر نفاق کا شبہ کیا کرتے تھے اور فرماتے کہ کہیں میں منافق تو نہیں ہو گیا ہوں۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ انھوں نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو بلایا، یہ حضرت حذیفہ کون تھے؟ وہ صحابیٔ رسول جن کو اللہ کے نبی ﷺ نے کچھ ایسی باتیں بتائی تھیں، جو کسی اور صحابی کو نہیں بتائی تھیں، اس لئے ان کو راز دار رسول کہا جاتا ہے، ایک دفعہ حضرت عمرؓ بن خطاب نے اپنے دور خلافت میں ان کو بلایا اور کہا کہ حذیفہ! تم سے ایک بات پوچھتا ہوں کہ حضورؐ نے تم کو کچھ باتیں بتائی تھی اور ان میں یہ بھی بتایا تھا کہ منافقین کون کون ہیں، کہیں میرا نام تو حضور ﷺ نے نہیں لیا تھا؟ اللہ اکبر! حضرت عمرؓ کو حضور ﷺ سے کیسی محبت تھی؟ کیسا تعلق تھا؟ اس کے باوجود ڈرتے ہیں، گھبراتے ہیں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ مجھ سے ناراض رہے ہوں اور حضور ﷺ نے میرا نام منافقوں میں شمار کرا دیا ہو۔

حضرت عمرؓ کی فضیلت

حضرت عمرؓ کو یہ خوف ان فضائل کے باوجود تھا جو آپ کے بارے میں حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمائے ہیں، خود حضرت حذیفہؓ نے ایک موقعہ پر یہ بتایا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو دروازہ فرمایا تھا، کہ جب تک یہ دروازہ باقی رہے گا، امت کے اندر فتنوں کے آنے کی کوئی صورت نہیں ہوگی، یہ دروازہ فتنوں کو روکے گا، تاکہ کوئی فتنہ امت میں نہ آنے پائے، لیکن جب یہ دروازہ وہاں سے ہٹ جائے گا تو پھر اس کے ذریعہ فتنے آنے شروع ہو جائیں گے، حضرت عمرؓ نے کہا کہ ایک بات بتادو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا تھا میں دروازہ ہوں، کیا وہ دروازہ توڑا جائے گا یا کھولا جائے گا؟ حضرت حذیفہؓ نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا کہ

اس دروازہ کوتوڑ دیا جائے گا۔ (بخاری:۳۳۲۱،مسلم:۲۰۸)

مطلب یہ کہ شہادت ہوگی، ایک تو ہے دروازہ کھولنا، جو دروازہ کھلتا ہے وہ بند بھی ہوگا، لیکن جو دروازہ ٹوٹ جاتا ہے وہ ٹوٹ ہی جاتا ہے، اس کے بننے کا سوال ہی نہیں ہوتا، مطلب یہ کہ جب اس دروازہ کوتوڑ دیا جائے گا تو امت میں فتنوں کا دور شروع ہوجائے گا، چناں چہ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد امت میں فتنوں کا دور شروع ہوگیا، جن کا سلسلہ آج تک برابر جاری ہے۔

بھائیو! یہ ڈر، یہ اللہ تعالی سے خوف انسان کو راہ ہدایت پر لاتا ہے، حضرات اولیاء خاص طور پر اللہ کا ڈر اپنے دلوں کے اندر رکھتے تھے، اسی ڈر کی وجہ سے گناہوں سے بچتے تھے، ان کو ہر وقت یہ ڈر وخوف لگا رہتا تھا کہ نہ معلوم موت کب آجائے، اللہ کے سامنے حاضری ہوجائے، نہ معلوم میرے گناہوں کے بارے میں میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے، کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھ کو جہنم میں پھینک دیا جائے۔

امام ابن مبارکؒ کا حال

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا نام آپ نے سنا ہوگا، بہت بڑے محدث اور فقیہ تھے اور بڑے بزرگ بھی تھے، جب ان کا آخری وقت آیا، اس وقت وہ اپنے پلنگ پر لیٹے ہوے تھے، بیقراری تھی، شاگرد جمع تھے، عبداللہ بن مبارکؒ نے فرمایا کہ مجھے اٹھا کر زمین پر لٹا دو، شاگردوں نے کہا کہ حضرت! زمین پر کیوں لیٹنا چاہتے ہیں، اوپر تو ذرا آرام ہے، نیچے رہنے پر آپ کو تکلیف ہوگی۔ عبداللہ بن مبارکؒ نے فرمایا: نہیں، مجھکو اٹھاؤ اور زمین پر ڈالدو۔ خیر حکم تھا، تو شاگردوں نے ان کو اوپر سے اٹھایا اور زمین پر ڈالدیا، ڈالتے ہی ان کی عجیب حالت ہوئی، چہرہ کو اور گالوں کو زمین پر رگڑنے لگے اور اللہ سے خطاب کر کے کہنے لگے کہ اے اللہ! کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھ

بوڑھے کو آپ جہنم میں ڈال دیں، اس بوڑھے پر رحم فرما، اس بوڑھے پر رحم فرما، بار بار یہی فرماتے چلے جا رہے ہیں۔

یہی تو اللہ کا ڈر ہے جو بندہ ءمومن کے قلب کے اندر ہمیشہ جاگزیں ہونا چاہئے جو اس کو صحیح سمت اور صحیح راستہ بتائے گا۔

ایک پتھر کا خوفِ خدا میں رونا

بھائیو! آج ہمارے دلوں کے اندر سے اللہ کا خوف نکل گیا، حالانکہ یہ خوف وہ چیز ہے کہ اللہ کی وہ مخلوق جس کو ہم بے جان سمجھتے ہیں اس کو بھی حاصل ہے۔ امام غزالی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ حضرت موسی علیہ السلام ایک دفعہ جا رہے تھے، اور ان کو جانا تھا کوہ طور پر اللہ سے ملاقات کے لئے، وہ کلیم اللہ تھے، اللہ سے گفتگو ہوتی تھی، اللہ سے ملاقات ہوتی تھی، جاتے جاتے راستہ میں ایک جگہ ان کو نظر آیا کہ ایک پتھر بہت زور سے رو رہا ہے۔ آپ کہیں گے کہ پتھر کس طرح رو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس کو ہم بے جان اور بے شعور مخلوق سمجھتے ہیں وہ حقیقت میں نہ بے جان ہے اور نہ بے شعور، بلکہ یہ سب چیزیں جاندار ہیں۔

عشق نبی میں ایک لکڑی کا رونا

خود ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعہ بخاری میں موجود ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک منبر لکڑی کا تھا، جو ویسا ہی معمولی سا بنا ہوا تھا، کوئی مستقل منبر نہ تھا، نبی اکرم ﷺ اس پر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے، کچھ لوگوں کو توجہ ہوئی تو انھوں نے مسجد کے اندر مستقل ایک منبر تعمیر کر کے وہاں نصب کر دیا اور لکڑی کا عارضی منبر جو وہاں پر موجود تھا، اس کو وہاں سے ہٹا دیا، اس کے بعد حسبِ معمول اللہ کے نبی

ﷺ جمعہ میں خطبہ ارشاد فرمانے تشریف لائے اور منبر پر کھڑے ہوئے، تو دیکھا کہ کسی کے بلک بلک کر رونے کی آواز آ رہی ہے، سب پریشان کہ یہ کون رو رہا ہے، صحابہ ادھر ادھر پریشان ہو کر دیکھنے لگے، پھر کسی نے بتایا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادھر وہ منبر رو رہا ہے جس کے اوپر آپ اب تک کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرماتے تھے، آپ ﷺ خطبہ چھوڑ کر اس کی طرف تشریف لے گئے اور جا کر اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے، کیوں رو رہا ہے؟ منبر جواب دینے لگا کہ یارسول اللہ ﷺ! اب تک آپ کی قربت مجھے نصیب تھی، نئے منبر کے بننے کے بعد مجھے ایک کونے میں ڈال دیا گیا، میں آپ کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے اس کو سینہ سے لگایا، اور اس کو تسلی دی تو وہ خاموش ہو گیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

” والذی نفس محمدٍ بیده لو لم التزمه مازال باکیاً حطباً حتی یوم القیامة، حزناً علی فراق رسول الله صلی الله علیه وسلم “

اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر میں اس کو اپنے سینہ سے نہ لگاتا تو یہ میری جدائی کے صدمے میں قیامت تک روتا رہتا، اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ جاؤ اس کو دفن کر دو)۔

(بخاری: ۳۳۱۹، ابن ماجہ: ۱۴۰۷، سنن الدارمی: ۴۱)

ہر چیز میں حیات وشعور ہے

بھائیو! ہم سمجھتے ہیں کہ ہم ہی ذی روح ہیں، ہم ہی ذی شعور ہیں، خدا کی قسم زمین بھی، آسمان بھی، چاند و سورج بھی، پتھر بھی، لکڑیاں بھی، پتے بھی اور یہ ذرّے

بھی، ان سب کے اندر حیات و جان بھی ہے اور ہم سے زیادہ احساس بھی موجود ہے۔مولانا رومی نے کہا ہے کہ:

خاک وباد وآب وآتش بندہ اند ❁ با من وتو مردہ با حق زندہ اند

کہ مٹی و ہوااور آگ و پانی ہمارے تمہارے لحاظ سے تو مردہ ہیں لیکن اللہ کے لحاظ سے زندہ ہیں۔چناں چہ قرآن میں ہے:

مَا مِنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰکِنْ لَّاتَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ.

(بنی اسرائیل:)

اسی طرح ان سب میں شعور بھی ہے اورسب سے زیادہ بے حس و بے شعور تو انسان ہے،جس کو دعوی ہے عقل کا،جس کو دعوی ہے شعور کا،سب سے زیادہ بے عقل تو یہی ہے۔

غرض حضرت موسی علیہ السلام گذر رہے تھے،ان کو آواز آئی پتھر سے رونے کی،تو اس سے پوچھا کہ تو کیوں رو رہا ہے؟ پتھر کہنے لگا کہ مجھے اللہ کا ڈر ہے کہ کہیں قیامت میں اللہ تعالیٰ مجھے بھی جہنم میں نہ ڈال دیں، میں کہتا ہوں کہ اس پتھر کو یہ خدشہ اس لئے ہوا ہوگا کہ قرآن میں ہے:" وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ"(تحریم:)(کہ جہنم کا ایندھن انسان اور پتھر ہے)لہذا اس نے کہا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اللہ تعالے مجھکو بھی جہنم میں ڈال دیں،اگر میں بھی ان جہنمی پتھروں میں رہا،تو میرا حشر بھی برا ہوگا،اس بات کو یاد کر کے میں رو رہا ہوں،اور کہنے لگا کہ آپ اللہ کے پیغمبر ہیں اور کوہ طور پر اللہ سے ملاقات ومناجات کے لئے جارہے ہیں،آپ میرے حق میں سفارش کر دیجئے۔

حضرت موسی علیہ السلام نے اسے تسلی دی اور کہا کہ میں اسوقت اللہ کے

دربار میں جارہا ہوں ،اللہ سے دعاء کرکے تیری بخشش کرادوں گا ،حضرت موسی علیہ السلام کوہِ طور پر پہنچے ،اللہ سے باتیں کرنے لگے ،ان باتوں کے درمیان حضرت موسی علیہ السلام اس پتھر کو بھول گئے ،اب دیکھئے اللہ کی رحمت اوراس پر قربان جایئے کہ جب واپس ہونے لگے تو اللہ نے کہا کہ موسی ! تم اس پتھر کو بھول گئے ؟ کیا تم نے اس سے سفارش کا وعدہ نہیں کیا تھا ؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے اللہ ! واقعی میں بھول گیا ،آپ سب کچھ جانتے ہیں ، اللہ تعالیٰ نے کہا کہ جاؤ ،اس سے کہہ دو کہ ہم نے اس کی مغفرت کردی اوراس کو بخش دیا ،اوردیگر پتھروں کے ساتھ اس کو جہنم میں داخل نہیں کروں گا ،حضرت موسی علیہ السلام خوشی خوشی واپس آئے ،اس کو خوشخبری سنادی اور چلے گئے ، پھر کچھ دنوں کے بعد حضرت موسی علیہ السلام کو کوہِ طور پر جانا تھا ،اسی راستہ سے جارہے تھے ، دیکھا کہ وہ پتھر پھر بھی رورہا ہے ، کہنے لگے کہ میں نے تو تجھ کو خوشخبری سنادی تھی اوراللہ کا پیغام بتایا تھا کہ اللہ تجھ کو جہنم میں داخل نہیں کریگا ، پھراب رونے کی کیا بات ہے؟ کہنے لگا کہ اے موسی ! اُس وقت اللہ کے خوف وڈر کی وجہ سے رورہا تھا اوراب اللہ کی محبت میں رورہا ہوں ، کہ جس خدانے مجھے ایسی نعمت عطاء کی کیا اس کی محبت میں مجھے نہیں رونا نہیں چاہئے ؟

(مکاشفة القلوب للغزالی)

اللہ اکبر ! ہم کتنی نعمتیں کھاتے ہیں ،لیکن کیا اللہ کی محبت دلوں میں سمائی ہے؟ اللہ کے حکم کے مطابق زندگی گزارنے کا کوئی جذبہ پیدا ہوا؟ جانور اللہ سے ڈریں اور پتھر میں اللہ کا خوف ہو،لیکن انسان بے خوف ہوکر زندگی گذاریں؟ کس قدر تعجب کی بات ہے۔

قرآن سے دلیل

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ پتھر کے رونے کی یہ بات کیا صحیح ہے اور اس کی کوئی دلیل ہے؟ تو میں عرض کروں گا کہ ہاں اس کی دلیل قرآن میں ملتی ہے۔ ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ، وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ، وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهَارُ. (البقرة: ۷۴)

اور بے شک پتھروں میں ایسے بھی ہیں جن سے پانی نکلتا ہے، اور بعض وہ ہیں جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جن سے نہریں پھوٹتی ہیں۔

حضرت مجاہد اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ جو بھی پتھر ایسے ہوتے ہیں جن سے پانی نکلتا ہے، یا وہ اوپر لڑھک کر گر جاتے ہیں، یا جن سے نہریں اور چشمے اُبلتے ہیں، وہ دراصل اللہ کے خوف کا نتیجہ ہوتا ہے۔

معلوم ہوا کہ پتھر کا خوف کھانا اور اس کی وجہ سے رونا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔

خوفِ خدا سے رونے کی فضیلت

حضرات! اللہ کے ڈر سے رونے کی بڑی فضیلت ہے، ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ ایک موقع پر سورۂ نجم تلاوت کر رہے تھے، جب اس آیت پر پہنچے:

﴿أَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ، وَتَضْحَكُوْنَ ، وَلَا تَبْكُوْنَ﴾

اللہ تعالیٰ نے کافروں سے کہا کہ تم اللہ کے اس کلام سے انکار کرتے ہوئے

تعجب کرتے ہو کہ کیسے نازل ہوگیا؟ اور اللہ کے کلام کا مذاق اڑاتے ہو، اور روتے نہیں ہو؟) (سوارۃ النجم:٦٠)

جب اللہ کے نبی ﷺ نے یہ آیتیں پڑھیں تو صحابہ کرام کو رونا آ گیا، پھر اللہ کے نبی ﷺ کو بھی رونا آ گیا، اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ خوشخبری سن لو! کہ جو آنکھ اللہ کے خوف اور ڈر کی وجہ سے روئے وہ آنکھ جہنم میں داخل نہ ہوگی۔

(الدرالمنثور:٧/٦٦٧)

یاد رکھو کہ جن آنکھوں سے اللہ کے ڈر کی وجہ سے آنسوں نکلتے ہیں، چاہے وہ مچھر کے پر کے برابر ہوں، مکھی کے پر کے برابر ہوں، اللہ تعالی اس کی بخشش فرمادیتے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ دو آنکھیں ایسی ہیں کہ جن پر اللہ نے جہنم کو حرام کر دیا ہے، بلکہ جہنم کی آگ چھو بھی نہیں سکتی۔

عینٌ بکتُ من خشیة اللّٰه، وعینٌ تَحْرُسُ فی سبیل اللّٰه

ایک وہ آنکھ جو اللہ کے ڈر و خوف سے روتی رہتی ہے اور ایک وہ آنکھ جو اللہ کے راستہ میں جاگتی رہتی ہے اور مسلمانوں کی حفاظت کا فریضہ انجام دیتی ہے۔

(ترمذی:١٥٦٣)

یعنی کچھ لوگ جہاد میں نکلے ہیں اور کچھ لوگ اللہ کے راستہ میں نکلے ہیں، کچھ لوگ دینی خدمت میں لگے ہیں، ان سب کی حفاظت کرنے کے لئے ایک آنکھ جو سوتی نہیں، جاگتی رہتی ہے، تاکہ ان کی حفاظت ہو سکے، ان کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے، اس آنکھ پر بھی اللہ جہنم کو حرام کر دیتے ہیں۔

دنیا میں رونا سیکھو

بھائیو! قیامت کے دن کے رونے سے بچنے کے لئے، اس دنیا میں کچھ ندامت کے آنسو بہالو، رات میں اٹھ کر رویا کرو، اپنے گناہوں کو یاد کر کر کے رویا کرو اوراس سے مانگا کرو، کہ اے اللہ! میں گنہ گار بندہ ہوں، مجھے معاف فرما، جب یہاں روئے گا، وہاں اس کی آنکھ محفوظ ہوگی، یہاں سوتا پڑا رہا، عیش کرتا رہا، اللہ اس کو کبھی یاد نہیں آیا، گناہوں کی گندگی میں زندگی کو ملوث کرتا رہا، ایک آنسو اللہ کے لئے کبھی نہیں بہایا، یوں ہی اس کی زندگی ہوگئی، قیامت کے میدان میں جاکر ”کل عین باکیة“ (ہر آنکھ روتی رہے گی) اس کو بھی روتے رہنا ہوگا، اور یاد رکھو! یہاں کا رونا ختم ہوجائے گا، قیامت کا رونا کبھی ختم نہ ہوگا، جیسے جہنم کبھی ختم نہ ہوگی، وہاں کی تکلیفیں بھی ختم نہ ہوں گی، اس لئے اس سے پہلے کہ وہ دن آئے، دنیا میں کچھ رولیا کرو، کبھی اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر ٹھنڈے دل سے غور کرلیا کرو، اور ساتھ ساتھ سوچو کہ ہم نے کیا کیا گناہ کئے، اللہ کے سامنے کیا منھ لیکر ہم جائیں گے، پھر جو آنسو نکلے گا وہ دل کو صاف کردے گا، وہ دل کو پاک کردے گا۔

اللہ کو رونا بہت پسند ہے، ایک واقعہ

فرمایا: ایک بزرگ تھے، جو بہت مقروض تھے، جب قرض خواہوں کا مطالبہ زیادہ ہونے لگا، تو ایک دن تمام قرض خواہوں کو بلایا کہ فلاں دن آجانا، قرض ادا کردوں گا، تو سب جمع ہو گئے، انتظار کرتے رہے، مگر ان کے پاس کچھ تھا ہی نہیں، کیا دیتے، لوگوں سے کہہ دیا کہ بیٹھ جاؤ، اللہ دیگا تو دیدوں گا۔

لوگ ٹھان کر آئے تھے کہ آج تو لیکر ہی جانا ہے، اس سے پہلے ٹلنا نہیں ہے، لہذا سب انتظار میں بیٹھ گئے، کچھ دیر بعد ایک بچہ مٹھائی بیچتا ہوا وہاں سے گزرا،

تو ان بزرگ نے اپنے خادم سے کہا کہ دیکھو کیا آواز ہے؟ خادم نے بتایا کہ ایک لڑکا مٹھائی حلوا بیچ رہا ہے اور آواز لگا تا جا رہا ہے، ان بزرگ نے کہا کہ بھائی! اس کو بلاؤ، اور ان مہمانوں کو حلوا لیکر کھلاؤ، چناں چہ اسے بلایا اور ساری مٹھائی خرید کر سب کو کھلا دی، جب سب لوگ کھا چکے تو اس بچہ نے مٹھائی کی رقم مانگی، وہ بزرگ کہنے لگے کہ اگر پیسے ہوتے تو یہ سب کیوں بیٹھے ہوتے؟ تو بھی ان کے ساتھ بیٹھ جا، جب اللہ دینگے تو دے دوں گا، اس پر وہ خوب رونے لگا، اور چیخ چیخ کر رونے لگا، پوچھا کہ کیوں روتا ہے؟ کہا کہ میری ماں مارے گی، اگر میں اس مٹھائی کی رقم نہ لیجاؤں، اسی درمیاں میں کچھ دیر بعد اللہ نے رقم کا انتظام فرما دیا، ایک صاحب نے ان بزرگ کے دروازے پر دستک دی، اور ایک تھیلی میں اشرفیاں لاکر حضرت کی خدمت میں پیش کر دیں، بزرگ نے خادم کو گننے کا حکم دیا کہ دیکھیں کتنی ہیں؟ جب گنی گئیں تو وہ اشرفیاں اتنی تھیں کہ قرض خواہوں کے قرض اور مٹھائی کی قیمت کے لئے کافی ہو گئیں، اور اس سے قرض بھی ادا کر دیا گیا، اور اس مٹھائی والے بچہ کو اس کی قیمت بھی دیدی گئی، سب چلے گئے، اس کے بعد یہ بزرگ اللہ تعالی سے کہنے لگے کہ اے اللہ! تو نے انتظام تو کر دیا، مگر رسوا کر کے دیا، جلدی نہیں دیا، اس کی کیا حکمت ہے؟ اللہ کی طرف سے الہام ہوا کہ ہماری طرف سے تاخیر اس لئے ہوئی کہ یہاں مانگنے والے تو سب تھے، مگر ان میں کوئی رونے والا نہیں تھا، جب ایک بچہ رونے والا آ گیا تو میں نے دے دیا۔

معلوم ہوا کہ اللہ کو رونا بہت پسند ہے، اس لئے اس کی جناب عالی میں رونے اور گریہ وزاری کی عادت ڈالنا چاہئے۔

آنکھ کو حرام لذت سے بچاؤ

بعض رویات میں ہے ”كُلُّ عَيْنٍ بَاكِيَةٌ“ ہر آنکھ قیامت کے دن روتی

رہے گی، سب پریشان حال خوف کے مارے روتے ہوں گے، لیکن تین آنکھیں اس دن رونے سے محفوظ رہیں گی، ایک وہ جو اللہ کے ڈر اور خوف کی وجہ سے روتی ہو ، دوسری وہ جو اللہ کے راستہ کی حفاظت کی خاطر جاگنے والی ہو، وہ قیامت میں محفوظ رہے گی ، تیسرے ''عین کفت عن محارم اللہ 'وہ آنکھ جو اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے اپنے آپ کو بچائے ، یہ وہ آنکھیں ہیں کہ قیامت کے دن سب آنکھیں دہشت و وحشت کے مارے روتی ہوں گی ، مگر یہ تین قسم کی آنکھیں خوشی کے آنسوں بہائیں گی۔

اس حدیث میں جو تیسری آنکھ کا ذکر ہے، اس پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے، وہ کیا؟ اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے پرہیز کرنے والی آنکھ، وہ آنکھ جو اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے رک جائے ، وہ آنکھ یہ سوچتی ہے کہ میں ایک غیر محرم کو دیکھ سکتی ہوں یا نہیں؟ ایک لڑکی کو میں دیکھ سکتی ہوں یا نہیں ؟ اس پوسٹر کو دیکھ سکتی ہوں یا نہیں ؟ انٹرنیٹ کے اندر ہزاروں خرافات ہوتے ہیں، اس کو میں دیکھ سکتی ہوں یا نہیں؟ اور اگر یہ دیکھنے کے لائق نہیں ہیں، تو وہ اللہ کے ڈر اور خوف سے اس کو لات ماردیتی ہے، ایسا آدمی اپنی آنکھ کو بند کر لیتا ہے، اگر چہ دل اندر سے مجبور کرتا ہے، لیکن وہ کہتا ہے کہ جس سے میرا خدا ناراض ہو، میں وہاں آنکھ نہیں اٹھاتا میں یہاں اندھا بن جاؤں گا، ایسی کوئی چیز نہیں دیکھوں گا اور حرام لذات کو اختیار نہیں کروں گا ، میں کہتا ہوں کہ آج کے دور کا بڑا گناہ اور عام گناہ بدنظری کا گناہ ہے، یہ بہت سارے گناہوں کا ذریعہ بنتا ہے، وہ مومن کامیاب ہے، جو چلتا ہے، گھومتا ہے، مگر اس کی آنکھیں اور دل کسی سے ٹکراتے نہیں، جیسے کوئی کار ڈرائیور باوجود یہ کہ راستہ میں بہت ساری گاڑیاں چلتی ہیں، پھر بھی بچتے بچاتے چلاتا ہے، یہ کامیاب ڈرائیور ہے۔

حضرت مرشدی مولانا ابرار الحق صاحبؒ ایک مرتبہ بنگلور تشریف لائے اور جامعہ مسیح العلوم، بیدواڑی میں حضرت والا کی مجالس بعد عصر ہوا کرتی تھیں، ایک دن بیان کے بعد کار میں بیٹھ کر قیام گاہ روانہ ہوئے اور میں بھی کار میں بیٹھا تھا، اور راستوں پر خوب ٹرافک تھی، اور حضرت کے ڈرائیور کار کو کبھی ادھر کبھی اُدھر گھماتے تاکہ اور گاڑیوں سے ٹکرانہ جائے، اس کو دیکھکر حضرت نے ارشاد فرمایا کہ: دیکھو تقوی اسی کو کہتے ہیں کہ اپنے آپ کو ہر خطرہ سے بچاتے ہوئے چلے، جیسے ڈرائیور صاحب کار کو خطرات سے بچاتے ہوئے چلا رہے ہیں، پھر فرمایا کہ وہی ڈرائیور کامیاب ہے جو کسی کو ٹکر نہ لگائے اور خود بھی کسی کی ٹکر نہ کھائے، اسی طرح جو نگاہ اس دنیا میں شریعت کے راستہ پر اس طرح چلے کہ کسی ناجائز چیز سے ٹکر نہ لے اور گناہ کا ارتکاب نہ کرے وہ کامیاب ہے۔

بھائیو! یہ بڑی عمدہ مثال ہے اس کو ذہن نشین کرلو، اور سمجھو کہ جس نے اپنی نگاہوں کی حفاظت کرلی، وہ کامیاب ہے، ایک حدیث میں آپ نے فرمایا:

النظر سهم من سهام ابليس مسموم. (حاکم: ۴/ ۳۴۹)

نظر شیطان کا زہریلا تیر ہے، جو نظر کی حفاظت کرتا ہے، تو عبادت میں حلاوت آتی ہے، الادب المفرد میں امام بخاریؒ نے لکھا ہے کہ فضول نظر سے بھی بچنا چاہئے، میں کہتا ہوں جب فضول نظر سے بھی بچنا چاہئے تو نظر بد سے بچنا بدرجہ اولی ضروری ہے۔

نوجوانو! اگر تم کو قیامت میں ہنسنا ہے اور رونا نہیں ہے تو اپنی آنکھوں کو حرام لذتوں سے بچاؤ، اور اس سے اندھے بن جاؤ۔

سید احمد شہید بریلویؒ کا ایک واقعہ

میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں جو عبرت انگیز ہے، اور یہ واقعہ میں نے حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک وعظ میں سنا ہے، اور یہ واقعہ ہے حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کا، حضرت سید احمد شہید بریلویؒ ہندوستان کے ایک مشہور بزرگ اور بڑے اللہ والے تھے، اور انھوں نے ہندوستان کے اندر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے فتوی پر جہاد کی مہم کا آغاز کیا تھا، انہی جہادی مہموں کا نتیجہ ہے کہ آگے چل کر یہ ملک آزاد ہوا، اور اگر چہ بظاہر یہ تحریکات ناکام ہوئیں، مگر در حقیقت بعد کی تمام تحریکات کے لئے یہی تحریکات پیش خیمہ تھیں، انگریزوں کے یہاں سے بھاگنے کا ذریعہ ان ہی علماء کرام کا طفیل ہے، بعض جاہل کہتے ہیں کہ صوفیاء نے جہاد نہیں کیا، حضرت سید احمد شہید بریلویؒ مایۂ ناز صوفی ہونے کے ساتھ مایۂ ناز مجاہد بھی تھے، انھوں نے سب سے پہلے آزادی کی جنگ لڑی ہے، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے فرمان پر وہ کئی جہادی مہموں پر گئے، بلکہ وہی سپہ سالار بھی تھے اور اسی میں ان کی شہادت واقع ہوئی، بعض جاہلوں نے صوفیاء کرام کے بارے میں یہ بات پھیلا رکھی ہے کہ صوفیاء صرف تسبیح گھونٹتے رہتے ہیں، دیکھو اگر تمہاری آنکھ ہو اور اگر تمہارے پاس دل و دماغ صحیح موجود ہو تو صوفیاء کرام کے کارناموں کو دیکھو، اور یہ کتنا بڑا صوفی ہے، جن کا نام سید احمد شہید بریلویؒ ہے، جو سب سے پہلے جہاد کی مہم کا آغاز کرنے والا تھا۔

الغرض سید احمد شہیدؒ ایک جہاد کی مہم پر گئے، پنجاب کا علاقہ تھا، وہاں پر پنجابی عورتیں باہر آتی اور جاتی تھیں، گھومنے اور پھرنے آتی تھیں، بازاروں میں بھی آتی جاتی تھیں، ایسے علاقہ میں حضرت کا اور تمام مجاہدین کا قیام تھا، ایک دن ایک پنجابی آدمی

حضرت کی خدمت میں آیا اور کہا کہ مولانا! میں ایک بات پوچھنے آیا ہوں کہ آپ ان اندھوں کو لیکر یہاں کیوں آئے ہیں؟ اور کیا بستی کے لوگوں میں آپ کو کوئی صحت مند لوگ نہیں ملے کہ آپ اندھوں کو لے کر آگئے؟ آپ تو کچھ دیکھتے ہوئے نظر آتے ہیں، مگر اتنے سارے یہ اندھے جو کچھ دیکھتے ہی نہیں، ان کا کیا کام ہے؟ حضرت نے کہا کہ میرے پاس تو کوئی اندھا نہیں ہے، سب آنکھ والے ہیں، اچھی طرح دیکھتے ہیں، پھر پوچھا کہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ یہ سب اندھے ہیں؟ اس نے کہا: میں ان سب کو اندھا اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں دیکھتا ہوں کہ ہماری عورتیں یہاں آتی اور جاتی ہیں، بازاروں میں بھی گھومتی پھرتی ہیں، حسین وجمیل ہیں، لیکن آپ کے ساتھیوں میں کا کوئی ایک آدمی بھی کسی عورت پر نگاہ نہیں ڈالتا، ان کو آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا، اس سے میں نے سمجھا کہ یہ سب اندھے ہوں گے، حسن وجمال کا کیا نظارہ کریں گے، حضرت سید احمد شہیدؒ نے فرمایا کہ بھائی! تم نے صحیح دیکھا، اس لئے کہ ہمارا کوئی آدمی کسی عورت کو نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتا، اس لئے کہ ہمارے قران کا حکم ہے:

"قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ"

ترجمہ: اے نبی! آپ مومنوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نگاہوں کو نیچا رکھا کریں۔

یہ عفت اور پاکدامنی کا تقاضا ہے، ہمارے یہ مجاہدین کسی عورت پر نگاہ نہیں ڈالتے، وہ شخص کہنے لگا کہ میں نے تو ان کو اندھا سمجھ لیا تھا، دراصل میں ہی اندھا تھا اور آج آپ نے مجھے بینا بنا دیا۔

حضرات! جو قران نہ پڑھتا ہو وہ سب سے بڑا اندھا ہے، جو حدیث نہ پڑھتا ہو وہ سب سے بڑا اندھا ہے، یہ اندھے نہیں ہیں، جو نیچے دیکھ رہے ہیں، وہ تو اللہ کے حکم کو دیکھ رہے ہیں۔

غرض یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین قسم کی آنکھ قیامت کے دن رونے سے محفوظ رہے گی، اللہ کے ڈر سے رونے والی آنکھ، اور اللہ کے راستے میں جاگنے والی آنکھ اور تیسرے ''کفت عن محارم الله ''وہ آنکھ جو اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے اپنے آپ کو بچائے۔

اصل حسن یہ ہے-ایک واقعہ

ایک مرید خانقاہ میں تھا، اسے کھانا پہنچانے ایک لڑکی مقرر کی گئی تھی، جب جب بھی وہ لڑکی کھانا دینے کے لئے آتی، تو وہ مرید اس لڑکی پر نظر بد ڈالتا تھا اور اس کو گھور گھور کر دیکھنے لگتا، شیخ کو معلوم ہوا تو انہوں نے اس لڑکی کو دست آور گولیاں دیں، جس کی وجہ سے اس کو دست شروع ہو گئے اور شیخ نے اس کی غلاظت ایک جگہ کسی چیز میں جمع کرنے کا حکم دیا، ان کے خدام اس کی غلاظت کو جمع کرتے رہے، دستوں کی وجہ سے وہ لڑکی نہایت ضعیف و نحیف ہوگئی، اس کی طبیعت نڈھال ہوگئی، چہرہ پھیکا پڑ گیا اور مرجھا گیا، اب شیخ نے اس لڑکی کو اس مرید کے سامنے بلایا، مگر اب وہ مرید اسے دیکھتا ہی نہیں، اس کی طرف کوئی التفات ہی نہیں، شیخ نے اپنے خدام سے فرمایا کہ وہ جمع شدہ غلاظت اُٹھا کر لاؤ، جب وہ لائی گئی تو شیخ نے اس مرید سے کہا کہ تم درحقیقت اس لڑکی پر اور اس کے حسن پر فریفتہ نہیں تھے، بلکہ اس کے اندر کی غلاظت پر فریفتہ تھے، اس لئے جب تک یہ غلاظت اس کے اندر تھی، تم اس کو گھور گھور کر دیکھتے رہے اور جب وہ باہر نکل گئی تو اب دیکھنے کو تیار نہیں ہو۔

واقعی عجیب طرح دنیا کی مادی و فانی محبتوں کا علاج کیا ہے، اگر یہ نسخہ یاد ہوگیا تو پھر کبھی بھی انسان دنیا کی ان فانی محبتوں کے پیچھے نہیں جائے گا۔

ایک حیرت ناک واقعہ

بزرگانِ محترم! یہ آنکھوں کے آنسوں بڑے قیمتی ہوتے ہیں، اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی آنکھ پر جہنم حرام ہو جاتی ہے، اور اس کے آنسوں جہنم کی آگ کو بھی بجھا دیتے ہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے زمانہ میں ایک عجیب قصہ پیش آیا، وہ یہ کہ لکھنو کا رہنے والا ایک آدمی تھا، کام دھام نہ ملنے کی وجہ سے پریشان تھا، ایک دفعہ اسے کسی نے مشورہ دیا کہ تو کسی اور شہر اور علاقہ میں چلا جا، ہوسکتا ہے کہ وہاں کچھ کام لگ جائے، وہ آدمی ایک سواری پر سوار ہوکر دوسری بستی کے لئے نکلا، راستہ میں ایک بستی پر سے گذر رہوا، اور بھوک تیز لگ رہی تھی، وہاں اُترا اور کچھ کھایا پیا اور آگے بڑھ گیا، ایک دوسرے مقام پر جانا تھا، وہاں گیا اور خوب کمایا، اس کی لڑکی کی شادی طے ہوگئی، اس نے کہا: اب شادی کرنے جانا ہے، روپئے پیسے جمع کر کے تھیلی باندھ کر، سوار ہوکر، پھر واپس آرہا تھا کہ راستہ میں ایک جگہ پر کھانے پینے کی ضرورت پڑگئی، وہاں پر اُترا تو لوگوں نے بتایا کہ یہاں پر ایک شخص کا انتقال ہوگیا ہے، اس لئے جنازہ میں شریک ہو جاؤ، تو وہ شخص جنازہ میں شریک ہوگیا اور وہ خود تدفین میں شریک رہا، فراغت کے بعد جب وہاں سے نکلنا چاہا، تو دیکھتا ہے کہ پیسوں کی تھیلی غائب، جس میں ہزاروں روپئے موجود تھے اور وہ اسی رقم سے اپنی بچی کی شادی کرنا چاہتا تھا، وہ سوچنے لگا کہ پیسے غائب ہوگئے ہیں، تو اپنے گاؤں جا کر کیا کروں گا، لوگ تھوتھو کریں گے، برا بھلا کہیں گے، اتنے سال غائب رہا، اب بچی کی شادی کا نمبر آیا، اب بھی کچھ لیکر نہیں آیا، گھر والوں کو کیا جواب دوں گا؟ پریشان ہوکر بیٹھا تھا کہ ایک آدمی نے اس سے پوچھا کہ کیا ہوا؟ اس نے کہا میری

تھیلی غائب ہوگئی ہے، پوچھا کیسے غائب ہوئی؟ اس نے کہا میں یہاں آیا ہوا تھا اور اس آدمی کی تدفین میں شریک رہا، جب باہر آکر دیکھتا ہوں تو یہ حال اور نوبت کہ پیسے غائب ہیں، اس نے کہا ہوسکتا ہے کہ کہیں قبر میں گر گئے ہوں، ذرا قبر کھود کر دیکھ لو۔ اس نے کہا ٹھیک ہے، اب یہ آدمی قبر کھودنے لگا، ابھی ذرا سی کھودا تھی کہ کیا دیکھتا ہے کہ اس کے اندر سے آگ کی لپٹیں آرہی ہیں، اور اس کی وجہ سے اس کے ہاتھ بھی جل گئے۔

اور وہ چیخیں مارتا ہوا بھاگا اور قبر سے باہر آیا، اور جو باہر آیا تو دیکھا کہ سب کچھ بدلا ہوا ہے، پورا ماحول بدلا ہوا ہے، نہ وہاں بازار ہے، نہ ویسی دکانیں ہیں، لوگ جیسے پہلے وہاں پہچان کے تھے، ویسا کوئی آدمی وہاں پر نظر نہیں آتا، بڑا عظیم الشان شہر وہاں پر آباد ہوگیا ہے، جبکہ اتنا بڑا وہاں کوئی شہر نہیں تھا، پہلے وہاں ایک گاؤں قریہ کی طرح تھا، اور چند دکانیں تھی، اب وہ گاؤں کہاں گیا؟ وہ پرانی آبادی کہاں گئی؟ یہاں تو پورا ماحول بدلا ہوا ہے، لوگوں سے اپنے وطن کے بارے میں پوچھا کہ فلاں نام کی بستی کو جانتے ہو، لوگ کہنے لگے وہ بستی اس وقت دنیا میں نہیں ہے، ہم سنتے تھے کہ کوئی بہت پرانی بستی تھی، لیکن اب نہیں ہے، یہ آدمی کہنے لگا یہ تبدیلی کیسے ہوگئی، ابھی دس پانچ منٹ پہلے کی تو بات ہے کہ میں یہاں تھا اور جانے کے لئے نکلا تھا، لوگوں نے کہا تم بے وقوف آدمی ہو، تھوڑی دیر کی بات کیسے ہوسکتی ہے، ہم اپنے باپ دادا سے سنا کرتے تھے کہ کسی زمانہ میں اس نام کی بستی تھی، لوگوں نے کہا کہ اب وہ بستی تو ہے نہیں، خیر اس نے کھانے کے لئے جو اپنے پاس تھوڑی بہت رقم تھی وہ نکالکر دکان میں دی کہ اس سے سالن روٹی دیدو، دکاندار نے کہا بھائی! یہ پیسہ آپ کونسے زمانہ کا اُٹھا کرلائے ہیں، یہ تو تین چار سو سال پہلے کے معلوم ہوتے

ہیں، اس نے کہا کہ تین چار سو سال کے کیسے ہو گئے؟ ابھی کچھ ہی دیر کی تو بات ہے، دکاندار نے کہا کہ اب یہ پیسے چلنے کے نہیں، حکومتیں بدل گئی ہیں، اور سب کچھ بدل گیا ہے، ایک طرف تو یہ حال، دوسری طرف قبر کی آگ کی تپش کی وجہ سے ہاتھ میں جلن اور درد و تکلیف محسوس ہو رہی تھی، جو وہاں پر ڈاکٹر وغیرہ تھے، ان سے اس کا علاج کرایا، لیکن تکلیف بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے، یہاں تک کہ بعض لوگوں نے اس کو مشورہ دیا کہ اس زمانہ میں تمہاری بستی نہیں ہے اور یہ کہ تم وہاں جاؤ تو کوئی فائدہ نہیں، اس لئے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان میں بہت بڑے عالم و محدث ہیں، جن کا نام حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ ہے، ان کی خدمت میں چلے جاؤ، ان کی خدمت میں تمہارا پورا واقعہ سناؤ، ہوسکتا ہے کہ وہ تم کو کوئی مشورہ دیں، لوگوں نے اس کو کچھ رقم دی اور اس کو دہلی کا راستہ بتا دیا، اب وہ دہلی پہنچ کر سیدھے حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ زمانہ حضرت شاہ صاحب کا بہت ہی عروج کا زمانہ تھا، ان کی عظمت کا سکہ سارے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا، ہر جگہ ان کو جاننے والے لوگ تھے اور ان کی فنِ حدیث میں بصیرت و مہارت ساری دنیا میں مشہور تھی، وہ شاہ صاحب سے ملا، اور کہا کہ میرے ساتھ ایسا ایک واقعہ پیش آیا اور میری تکلیف انتہائی شدید ہوگئی ہے، مجھے اس کا علاج بھی بتائیے اور یہ راز بھی بتائیے کہ یہ میرے ساتھ کیا واقعہ ہوا، شاہ صاحب نے اس کی گفتگو پوری تفصیل کے ساتھ سنی، پھر کہا کہ تمہاری بات سچی ہے، اس لئے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آخرت اور دنیا کے زمانہ میں بڑا فرق ہے کہ وہاں ذرا سی دیر تم جا کے آئے اور یہاں سالہا سال گذر گئے، چنانچہ حدیث میں اللہ کے نبیصلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو نیک بندہ قبر میں چلا جاتا ہے، اسے قیامت تک کا زمانہ صرف اتنا معلوم ہوگا، جیسے ظہر سے عصر تک کا زمانہ، ظہر

سے عصر تک کا زمانہ دو تین گھنٹے کا ہوتا ہے،قبر میں جانے کے بعد نیک آدمی جب قیامت میں اٹھے گا تو وہ کہے گا کہ الحمد للہ !میں ظہر میں سویا تھا ،عصر میں اٹھ رہا ہوں،مگر یہاں دنیا میں نہ معلوم کتنی صدیاں گزر جائیں گی۔

یہ راز اللہ والے جانتے ہیں، دنیا والے نہیں جانتے ،یہ وہ علوم ہے جو صرف انبیاء کے ذریعہ آتے ہیں،کوئی سائنسدان نہیں بتا سکتا،سائنسدانوں کا علم اوران کی عقل اس دنیا کی سطح پر گھومتی ہے،اور یہ علوم دینے والے حضرات انبیاء ہوتے ہیں، یاان کی وراثت پانے والے علماء کرام ہوتے ہیں۔

بہر حال شاہ صاحبؒ نے کہا کہ تمہاری بات سچی ہے،تم چونکہ قبر میں اُترے تھے، جوتم نے دیکھا تھا، وہ قبراور دوسرے عالم سے تعلق رکھنے والی چیز تھی، جو ذراسا لمحہ وہاں گذرگیا، تو یہاں زمانہ بدل گیا،حکومتیں بدل گئیں، خاندان تباہ ہوگئے اور معلوم نہیں کہ تمہارے خاندان کا کیا حال ہوا ہوگا ؟اب رہا یہ کہ تمہارا ہاتھ جل گیا، یہ دنیا کی آگ سے نہیں جلا ہے بلکہ یہ دوزخ کی آگ سے جلا ہے،قبر کی آگ دوزخ کی آگ ہے، دنیا کی آگ نہیں ہے،اگر دنیا کی آگ ہوتی تو ڈاکٹر کا علاج کافی ہوسکتا تھا،جہنم کی آگ کے لئے ڈاکٹر کا علاج کافی نہیں ،دنیا کی آگ سے جل جائے تو ڈاکٹروں سے علاج کراتے ہیں،مگر یہ تو جہنم کی آگ ہے جس کا کوئی ڈاکٹر علاج نہیں کرسکتا،اس کا ایک ہی ایک علاج میرے ذہن میں ہےاور وہ یہ کہ تم جاؤ کسی مسجد کے کونے میں بیٹھواور اپنے گناہوں کو یاد کر کے رویا کرواور جو آنسوں نکلیں ،اس کو تکلیف کی جگہ پر لگایا کرو،یہی ایک چیز دوزخ کی آگ کو بجھا دینے والی یعنی اپنے گناہوں پر یاد کر کے رونا ، اللہ کے ڈر سے رونا ،فرمایا جو آدمی اللہ کے ڈر سے اپنے گناہوں کو یاد کر کے روتا ہے، دوزخ کی آگ کواس سے بجھایا

جا سکتا ہے ،اس لئے اب اس کا ایک ہی علاج ہے کہ تم یاد کرو اپنے گناہوں کو اور روتے رہا کرو۔

بھائیو! یہ واقعہ بڑا عجیب وغریب واقعہ ہے ،ہمارے لئے عبرت کا سامان ہے ،اللہ کے سامنے روؤاور گڑگڑاؤ، جو آنکھ روتی ہے،جہنم اس پر حرام ہے، جو آنکھ کہ اپنے گناہوں پر اللہ کے خوف میں روتی ہے، وہ ضرور جنت میں داخل ہوگی اور جب خود جنت میں جائے گی تو پورے جسم کو لے کر جائے گی ،تنہا آنکھ تو جانے کی نہیں۔

کبھی کبھی قبر کے احوال کھل جاتے ہیں

اللہ تعالیٰ بعض مرتبہ اس دنیا کے اندر برزخ کے حالات کو ظاہر کر دیتا ہے ،لوگ کہتے ہیں کہ قبر میں کیا ہوتا ہے؟ اور بعض جاہل کہتے ہیں کہ ہم نے بعض قبروں کو کھود کر دیکھا مگر کچھ نہ نکلا۔لیکن بھائیو! جب اللہ دکھانا چاہتا ہے، تب ہی ہم دیکھ سکتے ہیں، جب اللہ دکھانا نہیں چاہتا ،آپ لاکھ کوشش کریں ،نہیں دکھائی دے گا، کیونکہ ان چیزوں کا دکھانا اور نا دکھانا یہ اللہ کے اختیار میں ہے۔مگر ہم کو اللہ نہ دکھائے تو اس کا انکار کرنا درست نہیں، کیونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن سے زیادہ روئے زمین پر سچا کوئی نہیں، اور نہ آئندہ کوئی ان سے زیادہ سچا انسان ہوسکتا ہے، انھوں نے ہم کو خبر دی کہ قبر میں حالات پیش آتے ہیں، اچھے بھی اور برے بھی ، عذاب قبر بھی ہوتا ہے،ثواب قبر بھی ہوتا ہے، اچھوں کے لئے اچھے معاملات ہوتے ہیں ، بروں کے لئے برے معاملات ہوتے ہیں ، جب نبی اکرم ﷺ جیسے سچے انسان نے سچی روایات میں، صحیح احادیث میں ہم کو بتا دیا ہے، تو اس پر یقین کرنا ہمارا فرض ہے اور صرف اس بات پر ان باتوں کا جھٹلانا کہ ہم کو نظر نہیں آتا ہے، خلاف عقل ہے۔آپ کیا کیا جھٹلائیں گے ،اگر آپ کو نظر نہیں آتا

ہے؟ خدا بھی تو نظر نہیں آتا، کیا خدا کو بھی جھٹلاؤ گے؟ جنت بھی تو نظر نہیں آتی، کیا جنت کا بھی انکار کروگے؟ دوزخ بھی نظر نہیں آتی، کیا دوزخ کو بھی جھٹلاؤ گے؟ فرشتے بھی نظر نہیں آتے، کیا ان کا بھی انکار کروگے؟ نہ معلوم کیا کیا چیزیں ہیں جو ہم کو نظر نہیں آتی؟ لیکن ان سب کو ماننا اس لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث صحیحہ اس سلسلہ میں مروی ہیں، تو بہرحال عذاب قبر ہوتا ہے۔

عذابِ قبر کا ثبوت

حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم گذر رہے تھے، دو قبریں تھی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان دو قبر والوں پر عذاب قبر ہو رہا ہے، ایک پر اس لئے کہ وہ پیشاب کے قطروں اور چھینٹوں سے حفاظت نہیں کرتا تھا، اور دوسرے پر اس لئے کہ وہ چغلی کھایا کرتا تھا۔ (بخاری:۲۰۹،مسلم:۳۴۹)

آج لوگ کھڑے کھڑے پیشاب کر دیتے ہیں، فیشن بن گیا ہے، حفاظت نہیں کرتے، پاکی صفائی کا اہتمام نہیں کرتے، اسلام کے اندر سب سے اہم پاکی اور صفائی ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”الطھور شطر الایمان“

پاکی آدھا ایمان ہے۔ (مسلم:۳۲۸،ترمذی:۳۴۳۹)

اور باقی آدھا ایمان دوسری چیزوں میں رکھا ہے، آپ پاک وصاف نہیں تو نماز نہیں پڑھ سکتے، آپ پاک وصاف نہیں تو خدا سے تعلق نہیں پیدا کر سکتے، اللہ سے تعلق کے لئے سب سے پہلے پاکی اور صفائی کی ضرورت ہے۔

کسی بھی نیکی کو حقیر نہ جانو

بھائیو! کسی بھی نیکی کو حقیر نہ سمجھو، حدیث میں ہے: **کل معروف صدقه**

کہ ہر نیکی صدقہ ہے۔ (بخاری:۵۵۶۲،ترمذی:۱۸۹۳)

اللہ کے نبی ﷺ نے یہ قید نہیں لگائی ہے کہ نیکی بڑی ہو تو صدقہ ہے، اونچی ہو تو صدقہ ہے، اس کی قید اللہ کے نبی ﷺ نے نہیں لگائی، کیونکہ کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی نیکی بھی کام آجاتی ہے اور جنت کا ذریعہ بنجاتی ہے، اور ایک حدیث میں ہے:

لا تحقرن من المعروف شياً، ولو أن تلقى أخاك بوجه طليق

کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے، اور وہ بھی ''نون تاکید'' کے ساتھ فرمایا کہ تم کسی بھی نیکی کو ہرگز حقیر نہ سمجھو، اگر چہ وہ یہی ہو کہ تم اپنے بھائی سے ہنس مکھ چہرے سے ملاقات کرو۔ (مسلم:۴۷۲۰،ترمذی:۱۷۵۶)

دیکھا کہ اللہ کے نبی ﷺ اس کو بھی حقیر نہ جاننے کا حکم دے رہے ہیں کہ کسی اپنے بھائی سے خوش دلی سے مل لیا جائے، اسکی کیا وجہ ہے؟ دراصل بات یہ ہے کہ آدمی عموماً چھوٹی نیکیوں کو نظر انداز کر دیتا ہے اور چھوٹی سمجھ کر اسکو ترک کر دیتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی ایک نیکی کو چھوٹی سمجھ کر چھوڑ دیتا ہے، آگے چل کر وہ بڑی بڑی نیکیوں سے غفلت برتنے لگتا ہے، واجبات میں کوتاہی ہو جاتی ہے، سنتوں کو ترک کر دیتا ہے، فرائض میں بے توجہی ہوتی ہے، ماں باپ کے حقوق صحیح طرح سے ادا نہیں کرتا ہے، ان کی خدمت سے اعراض کرتا ہے، غرض یہ کہ وہ کئی بڑی بڑی عبادتوں اور نیکیوں سے غفلت برتنے لگتا ہے، اس کی نوبت اس لئے پیش آئی، کیوں کہ وہ چھوٹی چھوٹی نیکیوں کو چھوڑتا چلا گیا، ان کو حقیر و ناقص سمجھ کر، انکو کمتر اور گھٹیا سمجھ کر، حالانکہ بعض اوقات بڑی بڑی عبادتوں کو وہ درجہ نہیں ملتا، جو چھوٹی چھوٹی

عبادتیں پالیتی ہیں، کیونکہ چھوٹی عبادات میں اخلاص ہوتا ہے اور بڑی میں اخلاص نہیں ہوتا، اور یہ بھی کیا معلوم کہ اللہ کو کب، کہاں، کونسی عبادت پسند آجائے اور اس کی بنا پر اس کی مغفرت ہوجائے۔

تہجد کے دو رکعت ہی کام آئے

ایک مرتبہ کسی بزرگ نے اپنے خواب میں حضرت جنید بغدادی کو دیکھا اور انہوں نے ان سے پوچھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ حضرت جنید بغدادی نے فرمایا کہ مجھے اللہ کے دربار میں پیش کیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: جاؤ ہم نے تمہاری مغفرت کردی، پوچھنے والے نے دریافت کیا کہ آپ کی بخشش کس بنیاد پر ہوئی؟ جنید بغدادی نے فرمایا کہ:

طاحت تلک الاشارات، وغابت تلک العبارات، وفنیت تلک العلوم، و نفدت تلک الرسوم ، و ما نفعنا الا رکیعات کنا نرکعها بالاسحار.

(صفوة الصفوة: ۲/۴۲۴،حلية الاولياء: ۱۰/۲۵۰)

کہ ساری کی ساری عبارتیں ختم ہوگئیں، وہ رموز ونکات ضائع ہوگئے، وہ علوم فنا کے گھاٹ اتر گئے، بس ہمارے حق میں سودمند ثابت ہوئیں تو وہ الٹی پلٹی، ٹیڑھی میڑھی، غلط سلط، دو رکعتیں ثابت ہویں جو ہم راتوں میں اُٹھکر پڑھ لیتے تھے۔

دیکھو! جنید بغدادی جنہوں نے احادیث کو سمجھا اور اس پر عمل کیا، جنہوں نے قرآن وحدیث کو سمجھا اور اس پر عمل کیا، نکات کو واضح کیا، جو سید الاولیاء کا لقب پانے والے بزرگ ہیں، جنہوں نے اللہ کی خاطر ساری دنیا سے بغض وعداوت مول

لی، جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا، جنہوں نے اللہ کی محبت کی طلب میں رات دن عبادتوں پر عبادتیں کیں، وہ بزرگ کہتے ہیں کہ نہ وہ فرائض و واجبات کام آئے، نہ وہ رموز و اسرار کام آئے، نہ وہ تصوف و سلوک کے حقائق و معارف کام آئے، کام آئے تو وہ دو رکعت نفل جو رات میں اٹھ کر پڑھے تھے وہ کام آئے، اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کبھی کبھی چھوٹی نیکی میں بھی جنت رکھ دیتا ہے، بندہ جب اسکو کرتا ہے، تو وہ اس جنت کو پالیتا ہے۔

عمل پر نہیں رحمت پر بھروسہ ہو

آدمی صرف نیکیوں پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائے، اللہ کی رحمت سے اپنے آپ کو الگ کر لے اور سمجھے کہ مجھے اللہ کی رحمت اور اس کے فضل کی کوئی ضرورت نہیں، یہ انتہائی نا معقول بات ہے، حدیث میں فرمایا: آپ ﷺ نے کہ کوئی بھی آدمی اپنی نیکیوں کے سبب جنت میں نہیں جائے گا، بلکہ اللہ کی رحمت سے ہی جنت میں جائے گا۔ (بخاری:۵۲۴۱، مسلم:۵۰۴۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس پر کہنے لگیں کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ بھی؟ فرمایا کہ ہاں میں بھی اللہ کی رحمت سے ہی جاوں گا، اس پر غور کرو کتنی بڑی بات خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں بھی اللہ کی رحمت سے جنت میں جاؤں گا، تو ہم اور آپ کس کھیت کی مولی ہیں، ہم کیسے اپنے اعمال پر بھروسہ کر سکتے ہیں، ہر گز نہیں کر سکتے، ہم ہر وقت، ہر آن، ہر گھڑی اللہ کے محتاج ہیں، اسکی رحمت کے بھکاری ہیں۔

ایک علمی نکتہ

یہاں ایک علمی نکتہ بھی سن لیجیے، وہ یہ کہ قرآن کی بعض آیات سے پتہ چلتا

ہے کہ اللہ تعالیٰ جنت میں انسانوں کو عبادت ونیکیوں کی بنا پر بھیجتا ہے، مثلاً قرآن میں ہے:

اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ○ [النحل : ۳۲]

تم جنت میں داخل ہو جاؤ بسبب ان اعمال کے جو تم کیا کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں داخلہ اعمال کے سبب ہو رہا ہے، اور یہ حدیث کہہ رہی ہے کہ کوئی بھی اپنی نیکیوں سے جنت میں نہیں جائے گا، اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں دو چیزیں ہیں، ایک عمل کا سببِ جنت ہونا اور دوسرے عمل کا عوضِ جنت ہونا، پہلی بات ثابت ہے اور دوسری بات منفی، لہذا قرآن میں جو یہ کہا کہ عمل کے سبب جنت میں داخل ہو جاؤ، اس میں عمل کو سببِ جنت کہا گیا ہے، اور حدیث میں جو یہ فرمایا گیا کہ عمل سے جنت نہیں ملتی اس کا مطلب یہ ہے کہ عمل جنت کا عوض نہیں، لہذا دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے، کہ ایک بادشاہ نے اعلان کیا کہ ہمارے خدام میں سے جو شخص فلاں کام انجام دے گا، ہم اس کو ایک لاکھ روپیہ انعام دیں گے، اور ایک وزیر نے وہ کام کر دیا اور بادشاہ نے اس کو وہ مجوزہ انعام دیدیا، اس مثال میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ وزیر کو جو انعام ملا، وہ اس کے کام انجام دیدینے کے عوض میں ملا ہے، بلکہ یہ تو سراسر انعام ہے، عوض کہاں کا ہو گیا؟ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کو جو انعام ملا وہ اس کام کو انجام دینے کے سبب سے ملا، اسی طرح جنت ہماری نیکیوں کے عوض میں نہیں ملتی بلکہ وہ تو اللہ کا انعام ہے، جو ہمارے اعمال کے سبب سے ہمیں ملتی ہے۔

بنی اسرائیل کے ایک عابد کا واقعہ

حدیث میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک عابد رہا کرتا تھا، جو بڑی بڑی عبادتیں کرتا تھا، بہت بڑا زاہد تھا، جو ہمیشہ اللہ کی یاد میں مصروف رہتا تھا، پانچ سو برس تک اس نے عبادت کی، اور اللہ نے اس کے لئے ایک چشمہ پانی پینے کے لئے جاری فرمایا تھا اور روزانہ ایک انار کھانے کے لئے اس کو دیا جاتا تھا، جب اس کا انتقال ہوا اور اس کو اللہ کے دربار میں پیش کیا گیا، تو اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا کہ جاؤ ہم اپنی رحمت سے جنت میں داخل کرتے ہیں، اس پر اس نے کہا کہ یا اللہ! وہ جو میں نے پانچ سو برس عبادت کی تھی، وہ کیا ہوئی؟ اللہ نے دو فرشتوں سے کہا کہ میری نعمتوں کا اس کی عبادت سے حساب لگاؤ، فرشتوں نے حساب لگایا تو پانچ سو برس کی عبادت کے بدلے میں صرف ایک آنکھ کی نعمت آئی تو اللہ تعالی نے فرشتوں سے کہا کہ اس کو جہنم میں ڈالدو اس لئے کہ اس کے پاس جنت میں جانے کا کوئی سامان ہی نہیں ہے۔

جب اس کو جہنم میں ڈال دیا گیا تو وہ اللہ کو پکار کر کہنے لگا کہ اے اللہ! اپنی رحمت سے مجھے بخش دے، الغرض اس کو جہنم سے نکال کر لایا گیا اور اللہ نے اسے اپنی نعمتیں یاد دلائیں اور فرمایا کہ بتا اب میری رحمت سے تو جنت میں جائے گا یا اپنی عبادت سے؟ اللہ فرماتے ہیں کہ اے میرے بندے تو نے دنیا میں کتنے ہزار لوٹے پانی پئے ہوں گے، ان کا بدلہ کون دیگا؟ کیا اب بھی تم اپنے اعمال کے بدلے جنت میں جانا چاہتے ہو، وہ فوراً سجدہ میں گر جاتا ہے اور روتا ہوا کہتا ہے کہ اے اللہ! میں نادان تھا، اپنی نادانی کی وجہ سے غلطی کر بیٹھا، مجھے معاف فرما دیجئے، اللہ اس کو معاف

کر دیتے ہیں اور جنت میں داخل کر دیتے ہیں۔اب بتاؤ بھائی! کوئی اپنے اعمال پر اعتماد کرسکتا ہے؟ اللہ ہم پر اپنا فضل فرمائے۔

(حاکم:۴/۴۷۸،شعب الایمان:۴/۱۵۱)

عبداللہ ابن مبارک کی عاجزی

امام عبداللہ ابن مبارکؒ ایک مرتبہ مجلس میں بڑے بے چین تھے،مضطرب تھے،پوچھا گیا کہ حضرت کیا بات ہے،کیوں پریشان ہیں؟ تو فرمایا کہ میں نے آج ایک جرأت کا کام کرلیا ہے،جس کی وجہ سے افسوس ہورہا ہے،اور پریشانی ہورہی ہے کہ میں نے کتنی بڑی جرأت کی ہے،لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیا کام کردیا ہے؟ تو فرمایا کہ آج میں نے اللہ سے دعاء کرتے ہوئے جنت مانگ لی ، میں کہاں اس کا حقدار ہوں کہ میں نے اس کی مانگ کی ہے۔

حضرت تھانوی کی عاجزی

حضرت تھانویؒ کہتے تھے کہ اے اللہ! مجھ جیسا گنہ گار جنت نہیں مانگ سکتا،اتنی درخواست کرتا ہوں کہ جنتیوں کی جوتیوں میں جگہ عطاء فرما دے،اور فرماتے کہ یہ جنتیوں کی جوتیوں میں رکھنے کا سوال بھی اس لیے کرتا ہوں کہ دوزخ کو برداشت کرنے کی سکت نہیں ہے،ورنہ تو میں دوزخ کا حقدار تھا۔

یہ حضرات بھی عجیب تھے،علم وعمل ،تقوی وطہارت ،عبادت وریاضت ، سب ہے مگر عاجزی کا یہ عالم،اور ایک ہم ہیں کہ کرتے تو کچھ نہیں،مگر جنت سے کم پر راضی ہی نہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اس کے پوری طرح مستحق ہیں۔

حاجی امداداللہ صاحبؒ کی تواضع

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ ، اتنے بڑے آدمی تھے،شیخ المشائخ تھے ہزاروں علماء وصوفیاء کے رہبر تھے، پھر بھی دعاء میں رات میں اُٹھکر یوں کہتے کہ اے اللہ! میرے پاس کچھ نہیں ہے، بالکل خالی ہوں، مگر تیرے بہت سے نیک بندے مجھے اچھا سمجھتے ہیں،ان کے نیک گمان اوران کے طفیل سے میری مغفرت فرمادے،سوچئے اتنے بڑے بڑے لوگ جن کا علم وعمل ،اورتقویٰ وزہد، بےنظیر تھا،وہ بھی اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھتے تھے۔

شان عبدیت

اللہ تعالیٰ کوعبدیت وعاجزی بہت پسند ہے،اسی لئے قرآن میں ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی شان کواُجاگرکیا گیا ہے،مثلاً قرآن کریم فرمایا گیاہے:''سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ'' (پاک ہےوہ ذات جس نے راتوں رات اپنے بندہ کوسیر کرائی) یہ معراج کے واقعہ کا تذکرہ ہے،اور یہاں آپصلی اللہ علیہ وسلم کوعبد یعنی بندہ فرمایا ہے،اگراللہ تعالے چاہتے تو یوں بھی فرماسکتے تھے کہ''پاک ہے وہ ذات جس نے راتوں رات اپنے نبی کوسیر کرائی،یااپنے محبوب کوسیر کرایا'' مگراس کے بجائے عبد کہہ کر یہ بتادیا کہ دراصل اتنا بڑا مقام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوعبدیت (غلامی) ہی کی وجہ سے ملا ہے،معلوم ہوا کہ اللہ کے نزدیک سب سے بڑا مقام مقام عبدیت ہے،اوراسی سے ساری عظمتیں اور بلندیاں نصیب ہوتی ہیں،اور جہاں عبدیت ختم ہوجاتی ہے،وہاں شرافت وعظمت بھی ختم ہوجاتی ہے،اس لئے عاجزی وتواضع نہایت ضروری ہے سالک کے لئے،اس لئے ہمیشہ عبادت کرنے کے بعد یوں کہے کہ اے اللہ! میں تیرے شایانِ شان کچھ

نہیں کر سکا، میں آپ کا کوئی حق ادا نہیں کر سکا، میں اپنی کمزوریوں و عیبوں کا اعتراف کرتا ہوں، حدیث میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلمفرمایا کرتے تھے کہ:

”لا اُحصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ“

اے اللہ! میں تیری شایان شان تعریف نہیں کرسکتا، آپ کی ذات ایسی ہے جیسا کہ آپ نے خود اپنی تعریف کی ہے۔ (مسلم:۵۱۷ ترمذی:۳۴۱۵)

جب اللہ کے شایان شان تعریف بھی نہیں کی جاسکتی تو اللہ کے شایان شان عبادت کیسے کی جاسکتی ہے۔اور جب سرور عالم یہ فرماتے ہیں تو ہما شما کا کیا کہنا؟

مرید صادق کی تعریف

ایک مجلس میں فرمایا: میں نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات میں حضرت مجدد صاحب کی ایک عجیب بات پڑھی، اور پڑھ کر کچھ دیر تک میرا سر چکرانے لگا اور میں حیرت میں ڈوب گیا، حضرت نے پہلے تو یہ نقل کیا کہ ایک بزرگ نے فرمایا کہ مرید صادق تو وہ ہے جس سے بیس (۲۰) سال تک کوئی گناہ صادر نہ ہوا ہو، اور بیس (۲۰) سال تک اس کے بائیں ہاتھ کا فرشتہ کچھ بھی نہ لکھ سکے، اسکو لکھنے کے بعد فرماتے ہیں کہ: لیکن میرا خیال تو اپنے بارے میں یہ ہے کہ شاید میرے دائیں ہاتھ کا فرشتہ بیس (۲۰) سال سے کچھ بھی نہ لکھا ہوگا، کیوں کہ میں نے کوئی نیکی ہی نہیں کی، اور میرے بائیں ہاتھ کے فرشتہ کو لکھنے سے فرصت ہی نہ ملتی ہوگی۔

بھائیو! دیکھا آپ نے کہ اتنے بڑے مجدد، اتنے بڑے مجتہد، اتنے بڑے صوفی و بزرگ، جنھوں نے الحادِ اکبری کو ختم کرنے سب سے پہلے قدم اُٹھایا، اور اکبر نے جو رسوم و رواج جاری کئے تھے، ان کو ختم کرنے کے لئے ننگی تلوار بن کر کھڑے ہو

گئے تھے، اور جنہوں نے دین کی حفاظت وصیانت کی خاطر اپنے آپ کو داؤ پر لگا دیا تھا، وہ بھی یہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے اپنے اعمال پر بھروسہ نہیں ہے، بلکہ اپنی نیکوں کو نیکی بھی سمجھنے کی ہمت نہیں کر رہے ہیں، اور اپنے آپ کو گنہ گا خیال کر رہے ہیں، اور کہتے ہیں کہ داہنی طرف کا فرشتہ تو بیکار بیٹھا ہوگا اور بائیں طرف کا فرشتہ بدی و برائی لکھنے میں ایسا مصروف ہوگا کہ اسے فرصت ہی نہ ہوگی۔

جب یہ حضرات یہ کہتے ہیں تو ہمارا اور آپ کا کیا ہوگا؟ کیا ہمیں اپنے عمل پر بھروسہ کر لینے کی اجازت ہوگی؟

استغفار بھی استغفار کے قابل

حضرت رابعہ بصریہ جو بہت بڑی زاہدہ عابدہ خاتون تھیں، وہ فرماتی ہیں کہ ہمارا استغفار بھی استغفار کے قابل ہے، یعنی جب ہم استغفار کرتے ہیں تو وہ اللہ کے شایانِ شان نہیں ہوتا اور اس میں بھی ہم سے گستاخی ہو جاتی ہے، اس کے آداب کا لحاظ نہیں رکھا جاتا، اس لیے اس استغفار پر پھر استغفار کرنا چاہئے۔

عاجز گنہ گار متکبر عابد سے بہتر ہے

فرمایا: کہ آدمی گناہ کر کے اپنے کو عاجز سمجھے، یہ بہتر ہے اس سے کہ نیکی کر کے اپنے کو بڑا سمجھے، کیونکہ نیکی کر کے بڑائی میں مبتلا ہوگا تو ساری عبادت بے کار گئی، اس سے کیا فائدہ ہوا کہ آدمی محنت مجاہدہ کیا مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ ملا؟ اس کے برخلاف ایک آدمی گنہ کر کے شرمندہ و پشیمان ہوا اور اس کی وجہ سے اس میں عاجزی وانکساری پیدا ہو جائے تو یہ عاجزی اس کے کام آئے گی۔

اللہ سے اللہ ہی کو مانگو

اللہ سے ہمیں کیا مانگنا چاہئے؟ دنیا والے تو اللہ سے دنیا مانگتے ہیں مگر سالکین کو چاہئے کہ

وہ اللہ سے اللہ ہی کو مانگیں۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ دعاء میں کہا کرتے تھے کہ:

تو کر بے خبر ساری خبروں سے مجھ کو ❁ الٰہی رہوں اک خبردار تیرا
کوئی تجھ سے کچھ، کوئی کچھ مانگتا ہے الٰہی میں تجھ سے طلبگار تیرا

فرماتے ہیں کہ دنیا والے لوگ کچھ کچھ مانگتے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ مجھے مال چاہئے، کوئی کہتا ہے کہ ڈگری چاہئے، کوئی کہتا ہے کہ بنگلہ چاہئے، مگر میں اللہ سے اللہ ہی کو مانگتا ہوں۔

❁ ایک حکایت

جیسے ایک قصہ ہے کہ سلطان محمود کا ایک غلام تھا، اس کا ایاز نام تھا، بادشاہ اُس سے بہت محبت کرتا تھا، دیگر درباریوں کو اسی بنا پر ایاز سے حسد ہو گیا کہ بادشاہ اس کو کیوں اتنا چاہتا ہے؟ بادشاہ نے اس کو بھانپ لیا، اور لوگوں کو یہ بتانا چاہا کہ میں کیوں ایاز سے اتنی محبت کرتا ہوں، ایک دن بھرا ہوا دربار تھا، اور یہ غلام ایاز بادشاہ کی پشت پر کھڑا اس کو پنکھا جھیل رہا تھا، اِسی درمیان بادشاہ نے کہا: میرے دربار کی جو چیز جس کو پسند ہو، میری طرف سے اس کو اجازت ہے کہ اس چیز پر وہ ہاتھ رکھ دے، وہ چیز اس کو دے دی جائے گی، سارے ارکانِ دولت ومشیران سلطنت اُٹھے اور انہوں نے اپنی اپنی پسندیدہ چیزوں پر ہاتھ رکھ دیا اور بادشاہ کی اجازت سے اس کو اُٹھا لیا، مگر ایاز خاموش اپنی جگہ کھڑا تھا، اس نے نہ کسی چیز پر ہاتھ رکھا نہ اس کو اُٹھانے کی کوشش کی، یہ دیکھ کر لوگ ایاز کو تکنے لگے کہ کتنا بڑا بے وقوف ہے کہ ایسی قیمتی چیزیں میسر آرہی ہیں مگر یہ نہ اپنی جگہ سے اُٹھتا ہے، نہ کسی چیز کو اُٹھاتا ہے، بادشاہ بھی یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا، اس نے کہا: ایاز! کیا تم کو ہمارے دربار کی

کوئی چیز پسند نہیں آئی؟ تم نے کسی چیز کو کیوں پسند نہ کیا؟ تو ایاز نے بڑا عجیب و بصیرت افروز جواب دیا، اس نے کہا کہ حضور! میں نے تو آپ کو پسند کرلیا ہے، اور جب آپ میرے ہو گئے تو سارا دربار میرا ہو گیا، اب مجھے کسی اور چیز کو پسند کرنے اور اُٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟

میرے دوستو! ایک مخلوق کا غلام جب اپنے آقا کی محبت میں اس مقام کو پہنچ سکتا ہے تو کیا اللہ کی ذات اس سے گئی گزری ہے؟ لہذا اللہ سے اللہ ہی کو طلب کرو، جب اللہ مل جائے گا تو سب مل جائے گا، جیسے اُس غلام ایاز نے بادشاہ ہی کو مانگ لیا تھا، اگر کوئی چیز مانگتا، تو صرف وہ چیز اس کو ملتی، بادشاہ کی محبت نہ ملتی، اسی طرح اللہ سے دنیا مانگو گے تو دنیا ملے گی، دنیا والے دنیا مانگتے ہیں، مگر عقلمند لوگ اللہ سے اللہ ہی کو مانگتے ہیں، جب اللہ کو مانگ لیا تو اللہ اُس کا ہو گیا، جس کا اللہ ہو گیا سب کچھ اُس کا ہو گیا، جیسے کہتے ہیں کہ: ''من کا ن للہ کا ن اللہ لہ'' کہ جس کا اللہ ہو گیا سب اس کا ہو گیا۔

خواجہ عزیز الحسن مجذوب صاحبؒ حضرت تھانوی کے جلیل القدر خلیفہ تھے، انہوں نے اپنے اشعار میں اس مضمون کو اس طرح ادا کیا:

تصور عرش پر ہے، وقفِ سجدہ ہے جبیں میری
مرا اب پوچھنا کیا، آسماں میرا زمیں میری
اگر اک تو نہیں میرا، تو کوئی شئی نہیں میری
جو تو میرا تو سب میرا، فلک میرا زمیں میری

عوام ہماری قدر نہیں کرتی

فرمایا: آج بعض علماء شکایت کرتے ہیں کہ عوام ہماری قدر نہیں کرتی، ہماری

توہین کرتی ہے، میں کہتا ہوں لوگ اُنہیں علماء کی قدر نہیں کرتے، جو اللہ سے نہیں ڈرتے، بلکہ اُلٹی سیدھی کرتے رہتے ہیں، اور جو علماء اللہ سے ڈر کر زندگی گزارتے ہیں، تقویٰ شعار ہوتے ہیں، تو ایسے علماء کی عزت آج بھی لوگ کرتے ہیں، ایک مثال سے اس کو سمجھا جاسکتا ہے، جیسے بنگلور کے شیخ کباب کہ اگر ان کو صرف مسالہ لگا کر بغیر پکائے لوگوں کو دیا جائے تو کوئی نہیں کھائے گا، بلکہ منہ میں رکھتے ہی سب تھوک دیں گے، حالانکہ اس میں گوشت بھی ہوتا ہے، مرچ اور نمک اور دیگر مسالہ جات بھی ہوتے ہیں، مگر اسے آگ میں تپائے بغیر منھ میں رکھیں گے تو فوراً تھوک دیں گے، لیکن جب ان کو آگ میں تپایا جائے اور اس کے بعد اس کو کھانے کو دیں، تو سب مزے لے لے کر کھائیں گے۔بعینہ اسی طرح علماء اگر صرف علم حاصل کریں، مدرسہ سے فارغ ہو جائیں، مگر اپنے آپ کو کسی بزرگ کے حوالہ کر کے اصلاح کی آگ میں نہ تپائیں، اور مجاھدات کی بھٹی میں نہ جلائیں، تو یہ کچے علماء ہیں، لوگ ان کو اسی طرح تھوک دیں گے، جس طرح کچے گوشت کو تھوک دیتے ہیں، ہاں اگر یہ مجاہدہ میں پک جائیں تو پھر کوئی بے قدری نہیں ہوگی، اور اگر کوئی اپنی بدذاتی سے کرے گا تو اس کا اثر خود اسی پر ہوگا، عالم کو اس کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔اس لئے علماء کو چاہیئے کہ وہ عالم بالکتاب ہونے پر اکتفاء نہ کریں، بلکہ عالم باللہ بنیں، عارف باللہ بنیں، متقی و پرہیزگار بنیں۔

حضرت شاہ ابرار الحق صاحبؒ کا ارشاد

ایک مجلس میں حضرت والا نے فرمایا: ایک مرتبہ مرشدی حضرت شاہ ابرار الحق صاحبؒ کہیں تشریف لے جا رہے تھے، کار میں سوار تھے، راستہ میں جاتے ہوئے پیٹرول ڈلوانے کے لئے پیٹرول بنک پر کار روکی گئی، تو دیکھا کہ وہاں پیٹرول

ڈلوانے ایک پیٹرول کا ٹینکر بھی کھڑا ہے، جس پر ہزاروں گیلن پیٹرول لدا ہوا ہے، حضرت والاؒ نے یہ دیکھ کر فرمایا: یہ ٹرک باوجود اس کے اوپر ہزاروں گیلن پیٹرول لدا ہوا ہے، پھر بھی یہ ٹرک خود چلنے کے لئے پیٹرول کا محتاج اس لئے ہے کہ اوپر والا پیٹرول اس کے اندر گھسا ہوا نہیں ہے، صرف اوپر اوپر ہے، اگر یہ پیٹرول اس کے اندر جاتا تو یہ پیٹرول بنک کے پیٹرول کا محتاج نہ ہوتا، اسی طرح علماء اگر علم تو حاصل کرلیں، لیکن وہ اوپر اوپر ہی رہے، زبان زبان پر رہے، دل کے اندر نہ جائے تو اس علم کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، اور اس سے دین کی گاڑی چل نہیں سکتی، جس طرح اس ٹرک کو اپنے پیٹرول کا کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے، علم اندر جانے کا مطلب یہ ہے کہ اس علم پر عمل کرے۔

بغیر تمرین کے صرف تدریس بیکار ہے

مدرسہ میں حضرت والا کی مجلس طلباء کے لئے ظہر بعد کچھ دیر کے لئے ہوتی ہے، ایک دن اُس مجلس میں فرمایا کہ آج میں ظہر میں بعض طلباء کو دیکھ رہا تھا، کسی کا رکوع صحیح نہیں، کسی کا سجدہ صحیح نہیں، کوئی سجدہ میں کہنیوں کو زمین پر رکھ رہا ہے، جو کہ سنت کے خلاف ہے، پھر فرمایا بڑی افسوس ناک بات ہے کہ مدرسہ میں تدریس ہو رہی ہے، تحقیق ہو رہی ہے، تصنیف وتالیف ہو رہی ہے، مگر دین پر چلنے کی تمرین نہیں ہو رہی ہے، حالانکہ درس میں نماز کے مسائل پر مالہ وماعلیہ کے ساتھ بحث ہوتی ہے، اُن مسائل کی احادیث کی تخریج ہوتی ہے، راویوں پر جرح قدح ہوتی ہے، سند پر زبردست کلام ہوتا ہے، یہ سب کچھ ہو، مگر رکوع ہی صحیح نہ ہو، سجدہ ہی صحیح نہ ہو، تو ایسی تدریس کا کیا فائدہ؟ اگر طلباء یہ مسائل تو جان لیں، مگر نماز صحیح نہ ہو، تو مدرسہ پر جو کچھ خرچ ہو رہا ہے وہ سب بیکار ہے۔

عبادت وریاضت اللہ کا فضل ہے، ایک واقعہ

فرمایا: جو بھی بندہ کچھ نیکیاں کرتا ہے، وہ محض اللہ کا فضل ہے، بندہ کے عمل کو اس میں دخل نہیں، صحابہ اکرام کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا﴿ فَضْلاً مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً﴾ (کہ ان کا ایمان وعمل نتیجہ ہے اللہ کے فضل وکرم کا) تو بدرجہ اولی ہماری عبادتیں اللہ کے فضل سے ہوں گی، مولانا رومی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک آقا اور اس کا ایک غلام بازار کچھ خریدنے گئے، راستہ میں نماز کا وقت آ گیا، تو غلام نے کہا آقا! میں مسجد میں نماز پڑھنے جانا چاہتا ہوں، آقا نے اجازت دے دی اور خود باہر کھڑا ہو گیا، انتظار کرتا رہا، نماز کے بعد سب نمازی چلے گئے، مگر یہ غلام نہیں آیا، آقا نے باہر ہی سے آواز دی کہ اے فلاں سب چلے گئے تو کیوں نہیں آتا؟ تو غلام نے کہا کہ مجھے آنے نہیں دیتے، یہ کہکر پھر رکعت باندھ کر نماز پڑھنا شروع کر دیا، پھر کچھ دیر بعد آقا نے آواز دی، غلام نے پھر وہی جواب دیا کہ مجھے آنے نہیں دیتے، اور یہ کہہ کر پھر رکعت باندھ لی، پھر آقا نے انتظار کیا اور کچھ دیر بعد آواز دی اور کہا کہ کون آنے نہیں دیتا؟ غلام نے کہا کہ جو آپ کو اندر آنے نہیں دیتا، وہ مجھے باہر نکلنے نہیں دیتا، اس جواب پر جی چاہتا ہے کہ قربان ہو جاؤں، معلوم ہوا مسجد میں جانا اللہ ہی کی توفیق سے ہے، ہمارا کوئی کمال نہیں۔

ایک دن منزل ضرور ملے گی

فرمایا: جب آپ صحیح اللہ والا تلاش کر لیں گے، تو ایک دن ضرور اللہ تک رسائی حاصل کر لیں گے، اس لئے کہ اللہ کے راستہ میں قدم رکھنے والا کبھی محروم نہیں ہو سکتا، آج نہیں تو کل، کبھی تو پہنچے گا، جیسے ایک آدمی کمزور بصارت والا چلتا ہے، آگے جا کر ایک جگہ ٹھوکر لگ کر گر جاتا ہے، پھر اُٹھتا ہے، ہمت کر کے چلتا ہے، تو وہ ایک دن ضرور

منزل تک پہنچ جائے گا، اسی طرح ایک گنہ گار بندہ کسی اللہ والے کی اتباع کر لے، اُس کے پیچھے چلتا رہے، اگر چہ گناہوں نے اُس کو گرا دیا ہو، شیطان نے زخمی کر دیا ہو، کوئی مضائقہ نہیں، وہ کبھی نہ کبھی ضرور خدا تک رسائی پالے گا۔

لہذا اُٹھو! توبہ کرو اور اللہ سے کہو، اے اللہ! ضعیف بندہ ہوں، کمزور بندہ ہوں، طاقت نہیں ہے، لیاقت نہیں ہے، صلاحیت نہیں ہے، لیکن تیرے راستہ میں چلنا ضرور چاہتا ہوں، میں تو میری نااہلی و ضعیفی سے گرتا رہوں گا، تو میرا ہاتھ ضرور پکڑے رہنا، میں زخموں سے کہیں چور چور ہو جاوں گا، تو میرے زخموں کی مرہم پٹی کرتے رہنا، جیسے کسی بزرگ نے کہا:

ہم نے طے کیں اس طرح سے منزلیں
گر پڑے، گر کر اٹھے، اٹھکر چلے

اس شعر میں میں نے ذرا سی ترمیم کر دی ہے کہ:

ہم نے پائیں اس طرح سے رفعتیں
گر پڑے، گر کر اٹھے، اٹھ کر اُڑے

اس میں اشارہ ہے کہ جو سالک کبھی نفس و شیطان کی چالوں و شرارتوں کا شکار ہو گیا، اور گناہ کا ارتکاب کر بیٹھا، مگر فوراً اللہ کی طرف رجوع کیا، اور نفس و شیطان کا مقابلہ کرنے کے لئے کھڑا ہو گیا، تو پھر وہ اللہ کی مدد سے نہ صرف یہ کہ منزلیں طے کرتا ہے بلکہ رفعتیں اور بلندیاں پالیتا ہے اور چل کر نہیں اڑ کے جاتا ہے، لہذا سالکین کبھی مایوس نہ ہوں، بلکہ عمل کے میدان میں برابر چلتے رہیں، اگر چہ گرتے پڑتے ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت مسیح اللہ خان صاحبؒ کے اعلیٰ ترین اخلاق

فرمایا میرے استاذ حضرت مفتی نصیر احمد صاحبؒ نے کہ حضرت مسیح اللہ خان صاحبؒ کو جو خطوط آتے، میں ہی حضرت والا کو پڑھ کر سناتا تھا، ایک مرتبہ کچھ لوگوں کی طرف سے حضرت والا کو خطوط آئے جس میں گالیوں کی بھرمار تھی، گستاخانہ الفاظ تھے، تو میں ایسے خطوط پڑھے بغیر ایک طرف رکھ دیتا، تو حضرت والا کہتے کہ ان کو کیوں نہیں پڑھتے؟ ان کو بھی پڑھو، میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ خطوط پڑھنے کے قابل نہیں ہیں، کیوں کہ ان میں گالیاں اور دھمکیاں لکھی ہیں، ان کو کیا پڑھوں؟ اس پر حضرت والا نے فرمایا کہ یہ دراصل اللہ کی طرف سے ہماری اصلاح کا انتظام ہے، کیونکہ لوگ ہمیں حضرت حضرت کہکر ہمارے دماغ کو عرش معلیٰ پر پہونچا دیتے ہیں، اس سے بڑائی و عجب پیدا ہوسکتا ہے، اس لئے اللہ تعالے ان لوگوں سے ہماری اصلاح فرماتے ہیں، یہی لوگ تو ہیں جو ہماری اصلاح کرتے ہیں، ہمارے اندر بڑائی آنے نہیں دیتے، یہ تو ہمارے مصلح ہیں، اللہ اکبر! کیا ظرف تھا ان حضرات کا، ایک تو یہ ہے کہ آدمی اخلاق جانے، بیان کرے، یہ تو بہت سے لوگ کر لیتے ہیں، مگر ان اخلاق کو عملی جامہ پہنانا، یہ بڑا کام ہے، سب کے بس کی بات نہیں ہے۔

شیخ کو احوال کی اطلاع دینا ضروری ہے

ایک مرتبہ احقر مرتب نے حضرت والا سے سوال کیا کہ اصلاحی تعلق قائم کرنے کے بعد حسب ہدایت احوال لکھ کر دکھانا چاہتا ہوں، مگر دل میں یہ خیال آتا ہے کہ احوال میں دو چیزیں ہوتی ہے، یا تو سالک اپنے اندر خوبیاں پاتا ہے یا خامیاں، خامیوں کی اطلاع شیخ کو کرنے کی کیا ضرورت ہے، وہ تو توبہ کرنے سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف فرمادیں گے، اور خوبیاں بھی شیخ کو بتانے کی ضرورت نہیں،

اس لئے کہ بندہ کا اپنی خوبیوں کو خوبیاں سمجھنا ہی غلط ہے، کیوں نکہ انسان کی کوئی بھی نیکی اللہ کے شایان شان نہیں ہوسکتی۔

تو حضرت نے فرمایا کہ یہ خیال غلط ہے، کیونکہ گناہ کے بعد صرف توبہ کافی نہیں ہوتی، بلکہ توبہ کے بعد اصلاح بھی ضروری ہوتی ہے، اسی لئے اللہ تعالی قرآن کریم میں فرماتے ہیں: ﴿ اِلَّا مَنۡ تَابَ وَآمَنَ وَأَصۡلَحَ ﴾ معلوم ہوا کہ توبہ کے بعد اصلاح بھی ضروری ہے، اور اصلاح اطلاعِ احوال کے بغیر کیسے ہوسکتی ہے؟ کیوں کہ شیخ کا صاحبِ کشف وصاحبِ الہام ہونا ضروری نہیں، پھر فرمایا کہ جب تک ڈاکٹر کو مریض اپنا مرض نہیں بتائے گا، صحیح علاج نہیں ہوگا، جب تشخیص صحیح ہوگی تو تجویز بھی صحیح ہوگی، اس لئے اپنی خامیاں جو جانتا ہو، وہ شیخ کے سامنے بیان کرے، تاکہ صحیح اصلاح ہو، رہا مسئلہ خوبیوں کا تو وہ بھی بتائے اور فرمایا کہ انسان کا یہ سمجھنا کہ میں فلان فلاں نیکی کرتا ہوں یہ غلط نہیں، بلکہ نیکیاں کر کے اپنے آپ کو با کمال سمجھنا غلط ہے۔

فطرت بدل نہیں سکتی

ایک مجلس میں فرمایا: انسان کے اندر ایک عادت ہوتی ہے، ایک فطرت ہوتی ہے، عادت بدل سکتی ہے، مگر فطرت بدل نہیں سکتی، اسی لئے ایک حدیث میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کہ:

اذا سمعتم بجبل زال عن مكانه فصدقوه واذا سمعتم برجل زال عن خلقه فلا تصدقوه. (مسند احمد: ۶/ ۴۴۳)

یعنی فرمایا کہ اگر تم کسی پہاڑ کے بارے میں سنو کہ وہ اپنی جگہ سے ٹل گیا تو اس کی تصدیق کرلو، اور اگر کسی آدمی کے بارے میں سنو کہ اس کی فطرت بدل گئی تو

اس کی تصدیق نہ کرو۔

معلوم ہوا کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل سکتا ہے، مگر کسی کی فطرت بدل نہیں سکتی، لہذا کسی کی فطرت ہی میں برائی ہو، تو چونکہ فطرت نہیں بدل سکتی، اس لئے اُس فطرت کا رُخ بدل دے، اور یہ ہوسکتا ہے، پھر فرمایا: دیکھو حالت کفر میں حضرت عمرؓ کی فطرت میں سختی اور غصہ تھا، اور وہ اسلام لانے کے بعد بھی باقی رہا، مگر پہلے اسلام کے خلاف یہ غیظ وغضب وشدت تھی، اور ایمان لانے کے بعد یہی شدت وغیظ وغضب کفر کے خلاف برتنے لگے، فطرت تو باقی رہی، مگر رُخ بدل گیا۔

اس پر اہل مجلس میں سے کسی نے سوال کیا کہ کسی کی فطرت میں ریا کاری ہوتو اُس کا رُخ کیسے بدلے، تو فرمایا: پہلے لوگوں کو دکھانے کے لئے کرتا تھا، اب اللہ کو دکھانے کے لئے کرے، اسی کو اخلاص کہتے ہیں، جو ریا کاری ایک گناہ کا کام تھا، وہ رُخ بدلنے سے ثواب کا کام ہو جائے گا۔ کیونکہ بعض لوگوں میں کسی بھی کام کو دکھا کر کرنے کی فطرت ہوتی ہے، اس دکھاوے کا رخ اگر مخلوق کی طرف ہو تو بُرا ہے اور اللہ کی طرف ہو تو اچھا ہے۔

خوابوں کی حقیقت

آج کل لوگوں کو خواب بہت نظر آتے ہیں، اور ان پر کلی بھروسہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں، اور اپنی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں لاتے، حضرت تھانویؒ نے اس سلسلہ میں ایک بڑی قیمتی بات فرمائی ہے، کہ اگر انسان کی جاگنے کی حالت درست ہو تو کتنا بھی بُرا خواب دیکھے، کچھ فرق نہیں پڑے گا، اگر جاگنے کی حالت درست نہ ہو تو کتنا ہی عمدہ خواب دیکھ لے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

مثلاً ایک آدمی نماز نہیں پڑھتا، روزہ نہیں رکھتا، ڈاڑھی نہیں رکھتا، اللہ سے

نہیں ڈرتا، ایسا انسان خواب میں یہ دیکھے کہ وہ خود جبرئیل بن گیا ہے، یا عرش پر پہنچ گیا ہے، تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، اس کے برخلاف کوئی نمازی ہو، اللہ سے ڈر کر زندگی گزارتا ہو، اوامر بجالاتا ہو، نواہی سے اجتناب کرتا ہو، اگر ایسا انسان خواب میں یہ دیکھے کہ وہ شیطان بن گیا ہے، کوئی ڈرنے کی بات نہیں، اسلئے کہ اللہ قیامت میں اچھا خواب دیکھنے کی وجہ سے نہیں چھوڑ دیں گے کہ بھائی تم دنیا میں بڑے اچھے خواب دیکھتے تھے، اس لئے جنت میں چلے جاؤ، اور ایسا بھی نہیں کہ جو برے خواب دیکھے اُسے یوں کہہ دیں کہ تم نمازی تو تھے، پرہیزگار تو تھے مگر برے خواب دیکھتے تھے، اس لئے جہنم میں چلے جاؤ، ایسا نہیں ہوگا، وہاں تو اعمال کا اعتبار رہے، خواب کچھ بھی ہو، کیا عجیب اُصول حضرت تھانویؒ نے فرمایا، اسی لئے تو حکیم الامت کا لقب دیا گیا ہے۔

ہاں اس کا مطلب یہ نہیں کہ خواب کی کوئی حقیقت نہیں، بلکہ خواب کی حقیقت ہے اور اس کو حدیث میں نبوت کا چھیالیسواں حصہ قرار دیا گیا ہے۔ مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ سب کے خواب اور ہر وقت کے خواب معتبر نہیں ہوتے، بلکہ خواب کی تین قسمیں ہیں: ایک خیالی خواب، ایک شیطانی خواب، اور ایک الہامی خواب، اس لئے خواب پر کلی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، بلکہ دیکھا جائے گا کہ کس قسم کا خواب ہے۔

حدیث میں ہے کہ ایک صاحب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میرا سر کٹ گیا ہے، اس پر آپ ﷺ کو ہنسی آ گئی آپ نے ہنس کر فرمایا کہ:

اذا لعب الشیطان بأحدکم فی منامه فلا یحدث به الناس

شیطان تم میں سے کسی کے ساتھ خواب میں کھلواڑ کرے تو یہ خواب لوگوں کو

بتاتے نہ پھرو۔ (مسلم:۴۲۱۳،مسند احمد:۱۳۸۶۴)

دیکھئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود فرمارہے ہیں کہ اس طرح کے بے تکے خواب بیان نہ کرو، اگر ہر خواب کوئی حقیقت رکھتا تو آپ یہ کیوں فرماتے۔

اللہ سے دین مانگو

مولانا حفظ الکبیر صاحبؒ جامعہ مفتاح العلوم ،جلال آباد میں بحیثیت مبلغ مقرر تھے ،اور حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے خلیفہ تھے، ہماری طالبِ علمی کے دور میں جلال آباد میں حضرت مسیح الامتؒ جہاں نماز پڑھتے تھے،اسی مسجد میں وہ جمعہ سے پہلے وعظ کہا کرتے تھے،ان کی باتیں بڑی دلچسپ بھی ہوتی تھیں اور بڑی کام کی بھی، وہ اپنے وعظ میں کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص اللہ سے دین مانگتا ہے تو اللہ اسے دین بھی دیتا ہے اور دنیا بھی دیتا ہے، اور اگر کوئی اللہ سے دنیا مانگتا ہے تو صرف دنیا دی جاتی ہے، دین نہیں دیا جاتا ، یہ کہہ کر مولانا ایک بڑی عمدہ مثال دیتے کہ جیسے آپ اگر کسی سے پانی مانگو گے تو صرف پانی نہیں ، بلکہ گلاس بھی ساتھ میں آئے گا، اسی طرح دودھ، چائے، کھانا وغیرہ مانگو گے تو مظروف کے ساتھ ظرف بھی آئے گا، اس کے برخلاف اگر آپ نے کسی سے کہا کہ گلاس لاؤ، یا پلیٹ لاؤ، یا کٹورا لاؤ، تو لانے والا صرف گلاس یا پلیٹ یا کٹورا ہی لائے گا، اس کے ساتھ مشروب یا ماکول نہیں آئے گا، وہ فرماتے تھے کہ اسی طرح اللہ سے اللہ مانگو گے، دین مانگو گے، تو اللہ دنیا کے کٹورے یا پلیٹ میں رکھ کر دین کی دولت دیں گے، چناں چہ جو اولیا اللہ ہوتے ہیں، وہ دنیا سے محروم نہیں ہوتے حالاں کہ وہ دنیا نہیں مانگتے، وہ اللہ سے دین مانگتے ہیں، مگر اللہ تعالے ساتھ میں دنیا بھی دیتے ہیں، اور ایسا سکون

دیتے ہیں کہ وہ اسباب کے پیچھے نہیں پڑتے ۔ اور اگر دنیا مانگو گے تو صرف دنیا دی جائے گی ، دین نہیں دیا جائے گا ، جیسے پلیٹ و گلاس مانگنے والے کو صرف پلیٹ و گلاس دئے جاتے ہیں ، اس میں کھانا پانی رکھ کر نہیں دیا جاتا ۔

محبت میں اعتدال ہو

اسلام ہر چیز میں اعتدال سکھاتا ہے ، حتی کہ دین پر چلنے میں بھی اسی کی تعلیم دی گئی ہے ، سب جانتے ہیں کہ اللہ تعالے کی محبت بڑی چیز ہے مگر اس میں بھی اعتدال مطلوب ہے ، ایک نوجوان نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ اللہ سے دعاء کر دیجئے کہ مجھے اللہ سے بے پناہ محبت ہو جائے ، اولاً تو عیسیٰ علیہ السلام نے انکار کیا ، مگر جب اس نے بہت اصرار کیا تو اُنہوں نے دعاء کر دی ، دعا قبول ہو گئی ، اور اسے بے پناہ محبتِ الٰہیہ دیدی گئی ، مگر نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کے ہوش اُڑ گئے ۔

اور ایسا ہو سکتا ہے ، ارے بھائی ! جب اس فانی دنیا کے عشق میں کوئی گرفتار ہو کر پاگل ہو سکتا ہے تو اللہ سے محبت کرنے والا پاگل کیوں نہیں ہو سکتا ، مولانا روم نے ایک جگہ لکھا ہے :

عشق مولیٰ کئے کم بود از عشق لیلیٰ

مولیٰ کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کیسے کم ہو سکتا ہے ، چناں چہ مجنوں لیلیٰ کے عشق میں ہمیشہ مدہوش رہتا تھا ، کچھ خبر نہیں رہتی تھی ، ایک جگہ جا رہا تھا ، ایک صاحب نماز میں کھڑے ہوئے تھے ، مجنون سامنے سے گزر گیا ، نمازی صاحب کو بڑا غصہ آیا ، جلدی سے نماز ختم کی اور جا کر اُسکو پکڑا ، اور ڈانٹنے لگے ، سمجھ نہیں ہے تجھے ؟ دیکھا نہیں ؟ اندھے کی طرح جا رہا ہے ؟ تو وہ کہنے لگا کہ ایک دنیا کی لیلیٰ کی وجہ سے میرا یہ حال ہے کہ آپ وہاں کھڑے تھے یا نہیں ، مجھے وہ بھی ہوش نہیں ہے ، تم کیسے

خدا کے عاشق ہو کہ نماز میں کھڑے ہو کر مجھے دیکھ رہے تھے، چاہئے تو یہی تھا کہ اللہ کے عشق میں پاگل ہو جاتے، مگر اسلام ایک معتدل مذہب ہے، اسلام یہ نہیں چاہتا کہ لوگ پاگل ہو جائیں، بلکہ شریعت چاہتی ہے کہ دنیا کا نظام بھی چلتا رہے، بیوی کے حقوق بھی ادا کرنا ہے، تجارت بھی کرنا ہے، کیوں کہ اسلام ایک معقول مذہب ہے، اگر کوئی شخص بیوی کا حق ادا نہیں کرتا تو اللہ خوش نہیں ہوتا، اگر کوئی شخص والدین کی عظمت نہیں کرتا تو اللہ خوش نہیں ہوتا، اگر کوئی شخص بچوں کا حق ادا نہیں کرتا تو اللہ خوش نہیں ہوتا، پڑوسیوں کے ساتھ احسان وسلوک کا معاملہ نہ کرے تو اللہ خوش نہیں ہوتا، جیسے انسان کے اندر چار چیزیں ہوتی ہیں، خون، بلغم، سودا، صفرا، انکو اخلاطِ اربعہ کہتے ہیں، ان کو اللہ نے ایک خاص توازن {LEVEL} کے ساتھ ہمارے اندر رکھا ہے، جب یہ اعتدال پر ہوں تو ہماری طبیعت ٹھیک رہتی ہے، جب ان میں افراط تفریط پیدا ہو جائے تو ہماری طبیعت بگڑ جاتی ہے، اسی طرح روحانی سلسلہ میں بھی ہے کہ ہر چیز اپنے اپنے حد کے اندر رہے کمی بیشی نہ ہو، اللہ کا خوف اپنی حد میں رہے، اور اللہ کی محبت ہے تو وہ اپنی حد میں رہے۔

سات آدمی عرش کے سایہ میں

حدیث میں ہے کہ امام عادل، انصاف پسند حاکم قیامت کے دن عرش کے سایہ میں ہوگا، اب سوال یہ ہے کہ ہر آدمی تو حاکم نہیں بن سکتا، ایک حاکم ہوگا تو لاکھوں محکوم ہوں گے، تو کیا یہ فضیلت صرف حاکم کے لیے ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ امام عادل سے اگر چہ حاکم و بادشاہ مراد ہے مگر اس کے عموم میں ہر وہ شخص داخل ہے جس کو اللہ نے چھوٹی بڑی کسی بھی قسم کی حکومت دی ہو۔

مثلاً ہر آدمی کو اللہ نے کسی نہ کسی قسم کی حکومت دی ہے کسی کو بیوی پر کسی کو

بچوں پر کسی کو شاگردوں پر کسی کو مریدوں پر کسی کو ماتحت کام کرنے والے نوکروں پر، لہذا جو بھی اپنے ماتحت کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ کرے گا وہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اس عموم میں داخل ہوکر اس فضیلت میں حصہ دار بنے گا۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ گھر کا ہر بڑا اپنے گھر کا حاکم ہوتا ہے، چنانچہ قرآن کریم میں ہے: ﴿ الرِّجَا لُ قَوَّا مُوْنَ عَلَى النِّسَا ءِ ﴾ (مردعورتوں پر حاکم ہو تے ہیں)۔ (النساء:۳۴)

اگر کسی کے بچے ہیں یا اور خدام وغیرہ ہیں، تو وہ آدمی اُن سب کا بادشاہ و حاکم ہے، اس طریقہ پر آدمی اپنی بیوی، بچوں اور خدام اور دیگر ماتحت لوگوں کے سا تھ انصاف وحسن سلوک کا معاملہ کریگا، تو وہ بھی امام عادل کے ساتھ شامل ہو جائیگا۔

ایک قرآنی دعاء کی تفسیر

قرآن میں ہے ﴿وَجَعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَاماً﴾ (الفرقان: ۷۴) اس میں دعاء سکھائی گئی ہے کہ اے اللہ! ہمیں متقیوں کا امام بنادے، حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ یہاں متقیوں کی امامت مقصود نہیں، بلکہ یہ کہنا ہے کہ اے اللہ! میں گھر کا امام تو ہوں، اگر ہمارے گھر والے فاسق رہیں گے، تو میں امام الفاسقین ہوجاؤں گا، آپ ہمارے گھر والوں کو نیک ومتقی بنادیں، تاکہ میں امام المتقین ہوجاؤں، اسی لئے اللہ نے یہ دعا سکھلائی، کہ بیوی متقی ہو تو یہ متقیہ کا امام ہوگا، بچے متقی ہوں تو متقی اولاد کا امام ہوگا، اگر خدانخواستہ بچے فاسق ہوں، بیوی فاسقہ ہو، تو یہ فاسقوں کا امام ہوگا، بہت سے لوگ پریشان ہوکر کہتے ہیں کہ ہمارے بچے بگڑ چکے ہیں، ایسے لوگوں کو یہ دعا اہتمام سے مانگنا چاہیے، اس طرح انسان امام عادل کی فضیلت میں داخل ہو جائے گا۔

حاکم کی دوسری شرح

حضرت حکیم اختر صاحب دامت فیوضھم نے امام عادل کی ایک عجیب شرح کی ہے وہ یہ کہ ہر انسان کی دوگز کی مملکت ہے، وہ ہے انسان کی باڈی (جسم) جس میں صوبے بھی ہیں، آنکھ ایک صوبہ ہے، کان ایک صوبہ ہے، دماغ ایک صوبہ ہے، پیٹ ایک صوبہ ہے اوران کا دارلسلطنت دل ہے، یہ سب ملاکر ایک سلطنت قائم ہوگئی، لہذا جو بھی اپنی اس مملکت پر عدل وانصاف قائم کریگا، وہ بھی امام عادل میں شامل ہے، یہ عاشقانہ تشریح ہے۔

عدل کیا ہے

اس حدیث میں امام کے ساتھ عادل کی صفت بھی لگی ہوئی ہے، لہذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عدل کی کیا تعریف ہے؟ اس کا جواب عدل کی ضد کو سمجھنے سے معلوم ہوگا، کیونکہ اشیاء تو اضداد ہی سے پہچانی جاتی ہیں، جیسے کہتے ہیں کہ: **(تعرف الاشیاء باضدادھا)** اگر آپ کو دن سمجھنا ہو تو رات کو سمجھئے، اگر یہ سمجھنا ہے کہ کالا کسے کہتے ہیں، تو گورے کو سمجھئے، اگر آپ کو یہ سمجھنا ہے کہ حسین کسے کہتے ہیں، تو قبیح کو سمجھئے، اگر دنیا میں سارے کے سارے حسین ہوتے، تو حسینوں کی اہمیت نہ ہوتی، بدشکلوں نے حسینوں کا مرتبہ بڑھا دیا، ورنہ ان کو کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا، اسی طرح عدل کی پہچان ظلم سے ہوتی ہے، اس لئے عدل کی ضد کو جاننا چاہئے، اور عدل کی ضد ہے ظلم، اور ظلم کہتے ہیں ہر اس کام کو جو اللہ کی مرضی کے خلاف ہو، قرآن میں اللہ نے گناہ گاروں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے: ﴿ظَلَمُوٓا أَنفُسَهُمْ﴾ کہ انہوں نے گناہ کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا، معلوم ہوا نافرمانی کرنا ظلم ہے، لہذا جو اپنی نظر کی حفاظت نہیں کرتا اور اس کو نافرمانی سے نہیں بچاتا، وہ ظالم ہے عادل نہیں، جو اپنے کانوں کو نافرمانی سے نہیں

بچاتا، وہ ظالم ہے عادل نہیں، جو زبان کو غلط استعمال کرنے سے نہیں بچاتا، وہ ظالم ہے عادل نہیں، جو اپنے دل کو گندے خیالات سے نہیں بچاتا، وہ ظالم ہے عادل نہیں، اس لیے امام عادل بننا ہو تو اپنی اس مملکت میں ظلم کو در آنے کا موقعہ نہ دیں۔

ہمارا بدن اللہ کا باغ ہے

یاد رکھو کہ ہمارا بدن اللہ کا بنایا ہوا باغ ہے، اس کی پرورش اور دیکھ بھال مالکِ باغ کی مرضی کے مطابق ہونی چاہئے، ہم صرف اس باغ کے مالی ہیں، مالک نہیں، اس لیے اس باغ میں ہم صرف وہی کام کر سکتے ہیں جو اللہ کی مرضی کے مطابق ہو، لہذا ہمیں زبان کو غلط استعمال کرنے کی اجازت نہیں، اور اسی لیے غیبت حرام ہے، جھوٹ حرام ہے، بہتان طرازی حرام ہے، چغل خواری حرام ہے، کیونکہ مالک نے زبان کو ان چیزوں میں استعمال کی اجازت نہیں دی ہے، اسی طرح ڈاڑھی کٹانے کی اجازت نہیں، اور ٹخنے ڈھانکنے کی اجازت نہیں، کیونکہ مالک نے اس کی اجازت نہیں دی ہے، جس طرح دنیا میں بھی باغ ہوتے ہیں، وہاں آپ مالک کی اجازت کے بغیر ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے، کوئی تصرف تو دور کی بات ہے، اسی طرح اللہ کے اس باغ میں بھی ہم اپنی مرضی سے تصرف نہیں کر سکتے، سارے اعضاء اس کی مرضی کے مطابق چلیں گے۔

اس سے یہ بھی سمجھ میں آ گیا کہ جو آدمی اس بدن میں اپنی مرضی سے تصرف کرتا ہے، اور حرام کاموں کا ارتکاب کرتا ہے، وہ اللہ کے اس باغ کو مالک کی مرضی کے بغیر تصرف میں لانے والا خائن ہے، جس کے بارے میں پوچھ ہوگی اور اس کو جواب دینا ہوگا۔

ایک لطیفہ

ایک جنٹل مین ایک مولانا سے کہنے لگے کہ مولویوں کو کیا ہو گیا کہ وہ ڈاڑھی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، تو مولانا نے جواب دیا کہ ہم کہاں پڑے ہوئے ہیں، ڈاڑھی کے پیچھے تو آپ لوگ پڑے ہوئے ہیں، کہ ذراسی بڑھی، اور کاٹ دی، ذراسی بڑھی پھر کاٹ دی، اور ہم تو ڈاڑھی چھوڑے ہوئے ہیں۔

ڈاڑھی رکھنا فطرت ہے، ایک لطیفہ

ایک صاحب حضرت مولانا سید اسماعیل شہیدؒ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ڈاڑھی رکھنا فطرت کے خلاف ہے، کیونکہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے، تو ڈاڑھی نہیں ہوتی، حضرت نے فرمایا: پھر تو آپ اپنے دانت بھی توڑ لیجئے، کیونکہ وہ بھی فطرت کے خلاف ہیں، اس لئے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے، تو دانت بھی نہیں ہوتے، قریب میں مولانا عبدالحی صاحب بڑھانویؒ بیٹھے ہوئے تھے، وہ کہنے لگے، واہ، کیا دنداں شکن جواب دیا۔

جس کا خدا ایسا ہو، ایک واقعہ

فرمایا حضرت جنید بغدادیؒ کے پاس ایک عورت اپنے شوہر کی شکایت لیکر آئی اور کہنے لگی، حضرت! میں اتنی حسین ہوں، پھر بھی میرا شوہر دوسری عورتوں کی طرف نظر کرتا ہے، اور غیر عورتوں کے پاس جاتا ہے، اور میری طرف کوئی التفات نہیں کرتا، پھر کہنے لگی کہ اگر شریعت میں پردہ کا حکم نہ ہوتا تو میں اپنا چہرہ آپ کے سامنے کھول کر بتاتی کہ مجھے اللہ نے کیسا حسین بنایا ہے، یہ سن کر حضرت جنیدؒ بے ہوش ہو گئے، ہوش آنے کے بعد مریدین نے پوچھا کہ حضرت! کیا بات تھی، کیوں آپ پر

غشی طاری ہوگئی، حضرت نے فرمایا کہ تم نے اس عورت کی بات سنی نہیں، وہ کیا کہہ رہی تھی کہ میرے جیسی حسین عورت کے ہوتے ہوئے بھی میرا شوہر دوسروں کی طرف نظر کرتا ہے، یہ سن کر مجھے ایک حدیث قدسی یاد آ گئی، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ فرماتا ہے کہ: جس کا خدا میرے جیسا ہو، کیا وہ بندہ مجھے چھوڑ کر دوسروں کی طرف نظر کرسکتا ہے؟ سورج کو دیکھو، چاند کو دیکھو، کتنے حسین ہیں، تو ان کو بنانے والا کیسا حسین ہوگا، جو مٹھاس کو پیدا کرنے والا ہے، اس میں کیسی مٹھاس ہوگی، ماں کے دل میں محبت پیدا کرنے والا خدا، بندوں سے کتنی محبت کرتا ہوگا، ایسے خدا کو چھوڑ کر ہم کہاں بھٹک رہے ہیں۔ (فانی تؤفکون)

مقتدٰی کا معیار لوگوں کے نزدیک

قرآن کریم میں اللہ تعالے فرماتے ہیں:

یٰٓاَ یُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوۡا اللّٰهَ وَ كُوۡ نُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ○

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور صادقین کے ساتھ رہو۔

اس میں اللہ تعالیٰ نے صادقین کی معیت اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے، اب سوال یہ ہے کہ ہم کس کی اتباع کریں، کس کے پیچھے چلیں، یہ ایک گھمبیر مسئلہ ہے، کیوں کہ ہر ایک آج یہی چاہتا ہے کہ لوگ میری اتباع کریں، آج لوگ مختلف معیار متعین کر رکھے ہیں، کوئی خاص منصب کو معیار قرار دیتا ہے، کوئی شہرت کو معیار قرار دیتا ہے، کوئی مالداری کو معیار قرار دیتا ہے تو کوئی عہدوں کو معیار مانتا ہے، مگر یہ لوگوں کے اُصول وضابطے قرآن وحدیث کے اُصول وضابطوں سے میل نہیں کھاتے۔

مقتدیٰ کا معیار قرآن کی نظر میں

میں کہتا ہوں کہ ہمیں معیار متعین کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، کیونکہ جب قرآن کریم کسی کی اتباع میں زندگی گزارنے کا حکم دے رہا ہے، تو مقتدیٰ کی تعیین اورنشاندہی بھی قرآن کریم کی ذمہ داری ہے، چنانچہ قرآن کریم نے اس مسئلہ کو صاف کردیا ہے، ایک جگہ قرآن مجید میں ہے: ﴿ وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ أَنَابَ اِلَيَّ ﴾ اللہ تعالے نے فرمایا کہ ایسے شخص کی اتباع کرو جو میری طرف متوجہ ہے، قرآن نے کیا عجیب اصول بیان کیا ہے مقتدیٰ کے انتخاب کا! فرمایا کہ جو میری یعنی اللہ کی طرف متوجہ ہو اُس کی اتباع کرو، جس پر اللہ کے عشق کا رنگ چڑھا ہوا ہو، ذکر کا رنگ چڑھا ہوا ہو، اس کی اتباع کرو، یہ نہیں فرمایا کہ: جس کا علم زیادہ ہو اُس کی اتباع کرو، جس کی شہرت زیادہ ہو، اُس کی اتباع کرو، جو عہدے والا ہو اُس کی اتباع کرو، بلکہ یہ فرمایا کہ جو اللہ کی طرف نظریں جمائے ہوئے ہو، جسے ہر آن اس کی رضا کا فکر ہو، اس کی خوشنودی کی جستجو ہو، اُس کی اتباع کرو۔

اسی طرح قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہے: ”فَاسْئَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ“ (اگر تمہیں علم نہ ہو تو اہلِ ذکر سے پوچھو) یہ آیت بڑی قابل لحاظ ہے، اس میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ موقعہ ایسا تھا کہ یہاں ”فَاسْئَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ“ کی جگہ ” فَاسْئَلُوْا أَهْلَ الْعِلْمِ“کہنا چاہئے تھا، کیونکہ یہاں علم نہ رکھنے والوں کو علم حاصل کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے، لہذا اھل علم سے علم حاصل کرنے کا حکم دینا چاہئے تھا، کیونکہ علم نہ ہو تو علم والوں سے ہی پوچھتے ہیں، نہ کہ جہلاء سے، جیسے مال نہ ہو تو مالدار سے مانگا جاتا ہے نہ کہ فقیر سے، اسی طرح علم نہ ہو تو اہل علم سے پوچھا جاتا ہے، نہ کہ اہل ذکر سے، مگر اہل ذکر سے پوچھنے کا حکم دے کر اللہ

تعالیٰ نے یہ بتا دیا کہ علم اُسی وقت سود مند و نافع ہوتا ہے، جب علم کے ساتھ اللہ کا ذکر بھی ہوتا ہو، جس علم کے ساتھ اللہ اور رسول کی اتباع ہوتی ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا:

الا انبئکم بخیارکم ؟ قالوا بلی یا رسول اللّٰہ، قال خیارکم الذین ا ذا رُؤوا ذُ کِرَاللّٰہ عز وجل) **(ابن ماجہ: ۴۱۰۹)**

یعنی اللہ والے وہ ہیں جنہیں دیکھ کر اللہ یاد آجائے ، یہ ہے اصل معیار اللہ والے کا جسے مقتدیٰ بنایا جا سکتا ہے۔ ورنہ ہر جبہ قبہ والا ، اللہ والا نہیں ہوسکتا ، جیسا کہ ہر سفید چیز چاندی نہیں ہوتی ، اور ہر پیلی چیز سونا نہیں ہوتی ، اسی طرح ہر علم والا اور ہر تقریر کرنے والا ، قابلِ اتباع اور مقتدیٰ نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس علم کے ساتھ ذکر و انابت ، تقویٰ وطہارت ، زہد وقناعت ، عبادت وریاضت جیسی صفات کا ہونا بھی لازم ہے۔

ایک سوال کا جواب

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ ''امیر جیسا بھی ہو اُسکی اتباع کرو''۔ ایک حدیث میں فرمایا کہ اگر چہ حبشی غلام کو امیر بنا دیا جائے اس کی بھی اتباع کرو۔ **(مسلم: ۳۴۲۰)**

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر امیر کی اتباع کرنا ضروری ہے، بظاہر یہ آیت قرآن سے متعارض معلوم ہوتی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث مطلق نہیں مقید ہے، یعنی ہر امیر کی اتباع کرو اس کے دائرہ میں ، مطلب یہ ہے کہ کوئی امیر ہو، کوئی عہدہ دار ہو، کوئی صدر ہو، کسی مدرسہ کا ذمہ دار ہو، کسی کالج کا ذمہ دار ہو، تو ان کی امارت اُن کی انجمن تک ، اُن کی صدارت اُن کے مدرسہ تک ، یا مسجد تک یا اسکول

وکالج تک محدود ہوگی ، اور یہ بھی ضروری ہے ، اس لئے کہ اگر ان کی اتباع نہ کی گئی تو سارا نظام درہم برہم ہو جائیگا ، نہ کوئی ادارہ چل پائے گا ، نہ کوئی انجمن ترقی کرے گی ، نہ کوئی مدرسہ یا اسکول یا کالج چل سکیں گے۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی کالج یا اسکول کا ذمہ دار ہو ، یا کسی ادارہ کا بانی وسر پرست ہو یا کسی جامعہ کا استاذ ہو ، تو قرآن وحدیث کے سلسلہ میں بھی اُسی کی اتباع کی جائے گی ، اور اس کو مقتدائیت حاصل ہو جائے گی ، ہرگز نہیں ، بلکہ اس کا معیار تو وہ ہے جو ابھی عرض کیا گیا کہ جو اہل ذکر واہلِ انابت میں سے ہو وہی اس کا حق رکھتا ہے کہ وہ مقتدیٰ بنے۔

گویا قرآن جس اتباع کی بات کر رہا ہے ، وہ اللہ کے اور دین کے راستہ میں چلنے کے سلسلہ میں اتباع ہے ، خدا تک رسائی پانے کے سلسلہ میں اتباع ہے ، وہ اتباع جس سے خدا مل جائے ، جنت مل جائے ، اُسکے لئے جب تک اللہ والے کی اتباع نہ ہوگی ، خدا کبھی نہیں مل سکتا ، اور حدیث جس اتباع کا ذکر کر رہی ہے اس سے مراد مختلف انتظامی امور میں اتباع ، لہذا کوئی تعارض نہیں۔

دنیا دار کی اتباع سے بچو ، ایک واقعہ

مقتدائیت کا یہ معیار سامنے نہ ہونے کی وجہ سے آج ہر کسی کی لوگ اتباع کر لیتے ہیں اور بعض وقت اسی کی وجہ سے گمراہی میں پڑ جاتے ہیں ، حتی کہ دنیا دار قسم کے لوگوں کی بھی اتباع کر لیتے ہیں ، اس پر ایک قصہ یاد آیا کہ ایک مرید نے ایک عجیب خواب دیکھا اور اپنے شیخ سے جا کر بتایا تا کہ اس کی تعبیر معلوم ہو جائے ، اس نے کہا کہ حضرت ! میں نے آج خواب میں دیکھا کہ میرے سامنے دو برتن ہیں ، اور ایک برتن میں شہد ہے ، اور ایک برتن میں نجاست ہے ، پھر دیکھا کہ آپ کے ہاتھ شہد

والے برتن میں ڈوبے ہوئے ہیں، اور میرے ہاتھ نجاست والے برتن میں پڑے ہوئے ہیں، یہ سن کر وہ شیخ صاحب کہنے لگے کہ اس کی تعبیر تو واضح ہے کہ ہمارے ہاتھ شہد میں ہیں یعنی دین میں ڈوبے ہوئے ہیں اس میں ہمارے دیندار ہونے کی طرف اشارہ ہے، اور تمہارے ہاتھ نجاست میں ڈوبے ہوئے تھے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تم دنیا دار ہو، دنیا کی مثال پاخانہ کی طرح ہے، اس لئے تمہارے ہاتھ پاخانہ میں ڈوبے ہوئے نظر آئے تھے، اور ہمارے ہاتھ شہد میں ڈوبے ہوئے نظر آئے تھے، اس مرید نے کہا حضرت ! آپ کی تعبیر تو صحیح ہے، مگر ابھی خواب پورا نہیں ہوا، پورا خواب سن لیجئے، کہ میں نے آگے خواب میں یہ بھی دیکھا کہ آپ کی شہد میں ڈوبی ہوئی اُنگلیاں میں چاٹ رہا ہوں اور میری نجاست میں ڈوبی ہوئی انگلیاں آپ چاٹ رہے ہیں، یہ سن کر وہ شیخ غصہ میں آ گیا اور اُس کو بھگا دیا، حضرت تھانویؒ کہتے ہیں: خواب کے اس آخری حصہ کی تعبیر میں دیتا ہوں، وہ یہ کہ اُس مرید کے ہاتھ واقعی دنیا میں ڈوبے تھے، مگر وہ دین لینے کیلئے شیخ کے پاس آیا تھا، اس لئے شیخ کے ہاتھ سے شہد چاٹ رہا تھا مگر وہ پیر مرید کو دین پہونچانے کے بجائے، اُس سے دنیا حاصل کرتا تھا، اس لئے وہ اس مرید کی نجاست سے آلودہ اُنگلیاں چاٹ رہا تھا۔

افسوس کہ یہ حال ہے آج، مقتداؤوں کا، اس لئے دنیا داروں سے بچنا چاہئے، اس لئے کہ دنیا دار کی اتباع سے دنیا ملتی ہے، دیندار کی اتباع سے اللہ ملتا ہے۔

کیا آج اللہ والے نہیں ہیں

فرمایا: آج کل لوگ یوں کہتے ہیں کہ اللہ والے آج کہاں ہیں ؟ جنید بغدادیؒ کہاں سے آئیں گے شبلی اور بایزید بسطامی کہاں سے آئیں گے، کہ ہم ان

سے فیض حاصل کریں؟ فرمایا: یہ شیطانی دھوکہ ہے، بلکہ ایسا کہنے والا ایک آیت کا در پردہ منکر ہے، اللہ نے فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ O

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور صادقین کی صحبت اختیار کرو۔

اس آیت میں لوگوں کو صادقین کے ساتھ رہنے کا حکم دیا گیا ہے، اس سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ ہر زمانے میں نیک ومتقی لوگ رہیں گے، یہ ایسا ہی ہے، جیسے باپ اپنے بچوں سے یوں کہے کہ بچو! روزانہ دودھ پیا کرو، اب اگر باپ بچوں کو دودھ کا انتظام نہ کرے تو وہ باپ ظالم ہوگا، اسی طرح اللہ تعالے یہ کہہ رہے ہیں کہ متقیوں کے ساتھ رہو، تو ہر زمانے میں متقیوں کو، اللہ والوں کو پیدا کرنا اس کا کام ہے، اب اگر کوئی یہ کہے کہ آج اللہ والے نہیں ہیں، تو گویا وہ یہ کہہ رہا ہے کہ آج قرآن کی اس آیت پر عمل نہیں ہوسکتا، اس لئے ایسا آدمی قرآن کی ایک آیت کا گویا منکر ہے، لہذا ایسا سوچنا غلط ہے، بلکہ آج بھی اللہ والے ہیں، ان کو تلاش کر کے اپنی اصلاح کریں، یہ الگ بات ہے کہ ہر زمانے کے اعتبار سے اللہ والے الگ الگ صلاحیتوں کو لیکر آتے ہیں، جوان کے زمانے کی ضرورت ہوتی ہے، کسی زمانے میں حضرت ابوبکر وعمر بن الخطاب وعثمان وعلی وعمر بن عبد العزیز کی ضرورت تھی، تو کسی زمانے میں امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد، امام ابن ابی لیلی وامام اوزاعی جیسے حضرات کی ضرورت تھی، کسی زمانے میں امام بخاری، امام مسلم، امام عبد الرزاق، امام ترمذی، امام ابوداؤد، ابن الجوزی، ابن الصلاح، ابن حجر جیسوں کی ضرورت تھی، کسی زمانے میں حسن بصری، شیخ عبد القادر الجیلانی، حضرت جنید وحضرت شبلی، بایزید بسطامی وغیرہ کی

ضرورت تھی، کسی زمانے میں رازی وغزالی وابن رشد کی ضرورت تھی،تو کسی وقت میں قاسم نانوتوی ،رشید احمد گنگوہی ،خلیل احمد سہارنپوری ،اشرف علی تھانوی کی ضرورت تھی تو ان کو پیدا کیا۔

اللہ والے کہاں ملیں گے

ایک اہم بات سن لو کہ بہت سے اللہ والے ہمارے بغل میں ہی رہتے ہیں،مگر ہم اُنکونہیں پہچانتے ،ہمارے ساتھ ہوتے ہیں،ہم نہیں جانتے،آپ نے سنا ہوگا کہ ہندوستان کے مغل بادشاہ شاہ جہاں کا جب آخری وقت آیا تو اُن کی اولاد میں حکومت وسلطنت کے بارے میں اختلاف ہوا،ان کی اولاد میں ایک تو دارا شکوہ تھا،دوسرے اورنگ زیب تھے، دونوں حکومت چاہتے تھے،اورنگ زیب نیک انسان تھے، وہ حکومت سے دین کوتقویت دینا چاہتے تھے،اور دارا شکوہ غلط کار صوفیوں میں رہنے کی وجہ آزاد منش ہوگیا تھا ،ایک مرتبہ دہلی میں ایک بزرگ آئے ،اوران کی شہرت ہوئی کہ ایک مستجاب الدعوات بزرگ تشریف لائے ہیں، ان سے حکومت کے لیے دعاء کروانے پہلے دارہ شکوہ گئے،اوران بزرگ صاحب سے ملاقات کی ،اُنہوں نے شاہزادے کا استقبال کیا اور کہا کہ میری گدّی پر بیٹھ جاؤ،مگر دارہ شکوہ نے براہِ ادب انکار کر دیا،اوران کے سامنے بیٹھ گیا،اور باتیں ہوتی رہیں، پھر رخصت کے وقت دارہ شکوہ نے کہا کہ حضرت! دعاء کیجئے کہ میرے باپ کی حکومت مجھے مل جائے ،وہ بزرگ کہنے لگے کہ ہم نے تو اپنی گدّی پر بٹھا کر آپ کوحکومت دینی چاہی ،مگر آپ نے انکار کر دیا،اب حکومت نہیں ملے گی، وہ افسوس کرتے ہوئے واپس ہو گئے، کچھ دیر بعد اورنگ زیب بھی ان سے دعاء کرانے حاضر ہوئے، بزرگ صاحب نے اُن کو بھی گدی پر بیٹھنے کا حکم فرمایا، پہلے

تو اورنگ زیب نے بھی براہِ ادب انکار کیا، پھر جب ان بزرگ نے حکم دیا تو ان کی گدی پر یہ کہتے ہوئے بیٹھ گئے کہ ” **الامر فوق الادب** “، پھر اورنگ زیب بھی مختلف امور پر گفتگو فرماتے رہے، پھر آخر میں عرض کیا کہ حضرت! دعاء کیجئے کہ میرے باپ کا تخت وتاج مجھے مل جائے، انہوں نے کہا کہ تخت پر تو ہم نے اللہ کے حکم سے آپ کو بٹھا دیا، مگر تاج میں نہیں دے سکتا، بلکہ آپ کا غلام جو آپ کو روزانہ وضو کراتا ہے، وہ اگر آپ کے سر پر عمامہ رکھ دے، تو تاج بھی مل جائے گا، اورنگ زیب نے تعجب سے کہا: میرا غلام جو میری جوتیاں سیدھی کرتا ہے، کیا وہ اتنا بڑا اللہ والا ہے، گھر گئے اور وضو کے بعد غلام کو حکم دیا کہ عمامہ پہنا دو، غلام نے کہا: حضور میں آپ کے سر پر کیسے رکھ سکتا ہوں، گستاخی ہوگی، اورنگ زیب نے کہا: میرا حکم ہے رکھ دو، اُس نے رکھ تو دیا مگر سمجھ گیا کہ میرا راز فاش ہوگیا ہے، اُس کے بعد وہ وہاں سے غائب ہوگیا، دیکھئے! جسے غلام اور نوکر سمجھا جاتا رہا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا کتنا بڑا مقام تھا، لہذا آج بھی اللہ والے موجود ہیں، مگر پہچاننے والی آنکھ چاہئے۔

اوصاف اہل اللہ

فرمایا کہ آج لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک کرامت کا ظہور نہ ہو، وہ اللہ والا نہیں ہوسکتا، اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ وہ سنتوں کا کتنا پابند ہے، اللہ سے کتنا ڈرتا ہے، اگرچہ کرامت ظاہر نہ ہو، اُس کی شہرت نہ ہو، ایک واقعہ لکھا ہے کہ کسی بزرگؒ کو معلوم ہوا کہ ان کے شہر میں ایک بزرگ آئے ہوئے ہیں، وہ بزرگ ملاقات و زیارت کے لئے تشریف لے گئے، جا کر دیکھا تو وہ مہمان بزرگ وضو کر رہے تھے، کچھ دیر وہ کھڑے ہو کر ان کا وضو دیکھتے رہے، پھر واپس آ گئے، ملاقات نہیں کی،

شاگردوں نے پوچھا کہ حضرت! آپ ان بزرگ سے ملنے گئے تھے، مگر ملاقات کئے بغیر واپس آ گئے، کیا بات ہے؟ فرمایا: میں اُن کے وضو کے طریقہ کو دیکھ رہا تھا، جو سنت کے خلاف تھا، جسے وضو کی سنتیں ہی معلوم نہ ہوں، وہ اللہ والا کیسے ہوسکتا ہے۔

اگر ہدایت نہ پانا چاہے

کوئی ہدایت نہ پانا چاہے تو نبی کا معجزہ بھی کام نہ آئے گا، جیسا کہ مولانا رومی نے مثنوی میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ابو جہل، رسول اللہصلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور کہا کہ میرے ہاتھ میں کیا ہے؟ اگر آپ بتا دیں گے تو میں ایمان لے آوٴں گا، رسول اللہصلی اللہ علیہ وسلمنے فرمایا کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں بتاوٴں کہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ تیرے ہاتھ کی چیز خود بتا دے کہ میں کون ہوں، اس کے بعد فرمایا کہ اپنے ہاتھ کو اپنے کان کے قریب لے جاوٴ، وہ جب اپنے کانوں کے قریب لے گیا، تو ہاتھ کی کنکریوں سے آواز آ رہی تھی (**لا اله الا الله محمد الرسول الله**) لیکن اس پر بھی اسے ہدایت نہیں ملی، اس نے ہاتھ کی کنکریوں کو پھینک دیا، اور کہنے لگا کہ محمد ﷺ کا جادو انسانوں ہی پر نہیں، کنکریوں پر بھی چلتا ہے۔

نوٹ: مثنوی شریف کے علاوہ کہیں کتب حدیث میں اس واقعہ کا ذکر نہیں ہے۔

دیکھئے ابو جہل ہدایت پانا نہیں چاہتا تھا، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ بھی اس کے کام نہ آیا۔

ایمان کی ٹھنڈک کیسے حاصل ہو

فرمایا: مجھے ایک واقعہ یاد آیا کہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب جدہ میں کہیں جانے کے لیے ایک مرتبہ کار میں بیٹھے، خوب گرمی تھی اور لُو چل رہی تھی،

حضرت نے فرمایا کہ ایرکنڈیشن چلادو، اے ،سی (AC) چلا دیا گیا، لیکن کار میں ٹھنڈک نہیں آئی، تو حضرت نے فرمایا کہ کیا وجہ ہے تمہارا ایرکنڈیشن کچھ ناقص ہے؟ ٹھنڈک کیوں نہیں آرہی ہے، تو ڈرئیور نے کہا کہ شاید کار کا کوئی شیشہ کھلا ہوا ہے، جس سے باہر کی گرمی اندر آرہی ہے، دیکھا تو ایک طرف کا شیشہ کھلا ہوا تھا، جلدی سے شیشہ بند کردیا گیا اور تھوڑی ہی دیر میں پوری کار ٹھنڈی ہوگئی، گرمی اور لو سے حفاظت ہوگئی، اس پر حضرت والاؒ نے ایک عجیب بات فرمائی جو قابل وجد ہے، فرمایا کہ اے، سی، چالو ہونے کے باوجود کار میں ٹھنڈک اس لئے نہیں آئی کہ اس کا ایک شیشہ ذرا سا کھلا ہوا تھا، اسی طرح اگر آنکھ کان، زبان وغیرہ کا شیشہ کھلا ہوا ہو، تو دل میں ایمان کی ٹھنڈک داخل نہیں ہوسکتی، اس لئے اگر ایمان کی ٹھنڈک چاہتے ہو، تو آنکھ کان وغیرہ پر پابندی لگانا ہوگا اور ان کو بند رکھنا ہوگا۔

طہارت کیا ہے

حدیث میں ہے ”الطھور شطر الایمان“ پاکی آدھا ایمان ہے

(مسلم:۳۲۸، ترمذی:۳۴۳۹)

اور ایک حدیث میں ہے کہ ”لاتقبل صلوة بغیر طھور“ (ترمذی:۱) کہ بغیر پاکی صفائی کے نماز قبول نہیں ہوتی، اب سوال یہ ہے کہ طہارت کیا ہے؟ سب سے پہلے یہ سمجھو کہ طہارت کے متعلق جو فرمایا کہ طہارت نصف ایمان ہے، دراصل اس میں جو لفظِ شطر آیا ہے اس میں علماء میں اختلاف ہے کہ شطر کے کیا معنی ہیں؟ بعض کہتے ہیں کہ شطر کے معنی آدھا اور نصف کے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ شطر کے معنی حصہ کے ہیں، اور یہ دونوں معنے صحیح ہیں، اگر شطر کو حصہ کے معنی میں لیا جائے تو اس حدیث کا معنی ہوگا کہ پاکی صفائی ایمان کا ایک حصہ ہے اور ایک جزو ہے جو بہت ہی اہم اور

عظیم ہے، اور اگر اس کو نصف کے معنی میں لیا جائے تو اب اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پا کی صفائی آدھا ایمان ہے، یعنی اس کا اتنا بڑا مقام ہے کہ نماز، روزہ، زکوۃ، حج، ذکر، درس وتدریس سب ایک طرف اور پاکی صفائی دوسری طرف، یعنی ایمان کے دو حصوں میں سے ایک حصہ میں ساری عبادات اور تمام احکامات ہیں، اور اس میں وہ سب کچھ ہے جو کہ اسلام کا مقتضیٰ ہے، اور دوسرے حصہ میں صرف پاکی صفائی، تنظیف وتطہیر ہے، اتنا بڑا مقام ہے طہارت کا۔

طہارت کے چار اقسام ہیں

اس پر بظاہر ایک شبہ ہوتا ہے کہ یہ بات کس طرح درست ہوسکتی ہے کہ تمام عبادات وسارے احکامات ایک طرف ہوں اور صرف پاکی وطہارت ایک طرف؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ شبہ اس لیے ہوتا ہے کہ ہم طہارت کا بہت ادنیٰ ومحدود مفہوم مراد لیتے ہیں، اور اگر اس کا وہ وسیع مفہوم مراد لیا جائے جو اسلام پیش کرتا ہے تو یہ شبہ خود کافور ہو جائے گا، علماء فرماتے ہیں کہ پاکی وطہارت کی چار قسمیں ہیں:

۱- اپنے ظاہر کو پاک کرنا، جس میں کپڑے بدن وغیرہ کی پاکی داخل ہے یہ سب سے ادنیٰ درجہ کی پاکی ہے۔

۲- اپنے ظاہری اعضاء کو گناہوں سے پاک کرنا، کیونکہ گناہ بھی ایک نجاست ہے، جیسے آنکھ، کان، زبان، ہاتھ، پیر، وغیرہ کو ان سے ہونے والے گناہوں سے بچایا جائے۔

۳- اپنے باطن اور دل کو باطنی گناہوں سے پاک کرنا، جیسے حسد، بغض، تکبر، انانیت، کینہ، وغیرہ سے پاکی حاصل کرنا۔

۴- اور یہ سب سے اعلی وارفع ہے، وہ یہ کہ اپنے دل کو ماسوی اللہ سے

پاک وصاف رکھے اور اپنے دل سے تمام فانی چیزوں کی محبت کو نکال دے، اور اس دل کو صرف اللہ کی محبت سے مزین رکھے۔

اس تفصیل کو سامنے رکھ کر سوچو کہ کیا یہ سب مل کر آدھا ایمان نہیں ہو گیا؟ اور کیا ان سب پر آدھے ایمان ہونے کی بات صادق نہیں آتی؟ اشکال اس لیے ہوتا ہے کہ ہم لوگ عام طور پر پاکی کو صرف جسم اور کپڑوں اور بعض ظاہری چیزوں کی پاکی تک محدود سمجھتے ہیں، حالانکہ اس کی اور بھی تین قسمیں ہیں۔

سوءِ حافظہ کا علاج

امام شافعیؒ ایک مرتبہ اپنے استاد امام وکیعؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، امام وکیع امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں سے ہیں اور امام بخاریؒ کے استاد ہیں، بہر حال امام شافعیؒ نے امام وکیع سے شکایت کی کہ بعض دفعہ کوئی چیز یاد کرتا ہوں تو یاد نہیں رہتی، بھول جاتا ہوں، اس کا کوئی علاج بتایئے، امام وکیعؒ نے فرمایا کہ گناہ چھوڑ دو، علم الٰہی تمہیں حاصل ہو جائے گا کیوں کہ علم دین دراصل علم الٰہی ہے اور علمِ الٰہی گناہ گار کو نہیں دیا جاتا۔

اس واقعہ کو امام شافعیؒ نے اپنے اشعار میں اس طرح بیان کیا ہے:

شکوت الی وکیع سوء حفظی ❁ فاوصانی الی ترک المعاصی
فان العلم نور من الٰہی ❁ و نور اللہ لا یعطی لعاصی

میں آپ طلباء کرام کو دعوتِ فکر دیتا ہوں، آپ لوگ سوچیں، ذرا غور کریں کہ امام شافعیؒ جیسے جلیل القدر امام سے بھی کوئی گناہ ہوتا تھا؟ کیا وہ گناہ کیا کرتے تھے؟ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ معصوم تھے، یہ عصمت تو انبیاء کی شان ہے، اور بڑے سے بڑا امام بھی گناہ کر سکتا ہے، مگر ان کے جلیل القدر مقام کو دیکھ کر دل یہ کہتا

ہے کہ وہ اگر چہ معصوم نہیں تھے، کبھی کبھی ہوسکتا ہے کہ گناہ صادر ہوجائے لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ گناہ گار اور دن رات گناہوں میں ملوث تھے، اس کے باوجود امام وکیع نے ان کو یہ نصیحت کی کہ گناہ چھوڑ دو، سوال یہ ہے کہ جب امام شافعی گناہ گار نہیں تھے تو پھر امام وکیع نے ان کو یہ نصیحت کیوں کی؟ اس کا جواب یہ کہ امام وکیع کی اس تلقین سے مراد یہ نہیں کہ گناہ چھوڑ دو، کیونکہ وہ تو پہلے سے چھوڑے ہوئے ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ خلافِ اولی کام بھی نہ کرو، جب امام وکیع یہ کہہ رہے ہیں کہ خلافِ اولی کام بھی ترک کردو، تو ذرا اندازہ لگائیے کہ گناہ کا کام کرنے والے کو کس طرح علم حاصل ہوسکتا ہے؟ اس لئے بھائیو! گناہ سے بچنا اور اس سے پرہیز کرنا چاہئے، تاکہ علم الٰہی دل میں اُتر جائے، ورنہ اگر نور الٰہی دل میں پیدا نہ ہو تو جینے کا کیا مزہ؟ اس سے تو موت کئی گناہ بہتر ہے، دعاء ہے کہ اللہ ہم سب کو اپنا غلام بنائے، آمین۔

مسیح الامت کا تعلیمی دور

ہمارے حضرت مسیح الامت مولانا شاہ مسیح اللہ خان صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ دار العلوم دیوبند میں میرے ساتھ کمرے میں دو ساتھی اور تھے، اور ایک ہی کمرے میں رہتے تھے، اور دو سال تک ہم سب ایک ہی کمرے میں تھے، مگر میں نے کبھی بھی ان سے مل کر بات چیت اور غپ شپ نہیں کی، حتی کہ مجھے اس طویل عرصہ میں ان کا نام تک معلوم کرنے کا موقعہ نہیں ملا، اور فرمایا کرتے تھے کہ میں اس دور میں درس گاہ، حجرہ اور مسجد کے علاوہ کسی جگہ نہیں گیا، حتی کہ دفتر بھی نہیں گیا۔

بھائیو! سنا آپ نے کہ کس قدر عقل کو حیران کرنے والا واقعہ ہے کہ دو سال ایک ہی کمرے میں رہتے ہوئے گزر گئے، مگر حضرت والاؒ کو اپنے کمرے کے ساتھیوں کا نام تک معلوم نہ ہوسکا، ان سے بات چیت اور ایران و توران کی گفتگو تو دور کی بات

ہے،بس حضرت کا معمول یہ تھا کہ کمرے سے نکلے،تو درسگاہ پہنچے،پھر درسگاہ سے کمرہ پہنچ گئے اور مطالعہ شروع کردیا،اوراسباق کی فکر میں لگ گئے،اور جب نماز کا وقت ہو اتو مسجد چلے گئے،کسی سے بات چیت نہیں ،یہ درحقیقت طالب علم کے طالب علم ہونے کی شان ہے،تب جا کر علم اپنا تھوڑا سا حصہ دیتا ہے۔اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ سے اللہ نے دنیا میں ایک بڑا فیض کا سلسلہ جاری فرمادیا اور آپ کے خوشہ چینوں میں ہزاروں علماء وصوفیاء آج بھی علم کا دریا بہار ہے ہیں۔

زبان تو ذکر کے لئے ہے

ایک بزرگ نے بڑی عبرت خیز بات فرمائی ہے کہ جب بچہ رحم مادر میں ہوتا ہے تو اللہ تعالےٰ اس کی پرورش کرتے ہیں،اسے رزق پہنچاتے ہیں،کس طرح ؟اس طرح کہ عورت کو جو ماہانہ خون آتا ہے،اسی خون کو اللہ تعالے اس کی غذا بنادیتے ہیں لیکن بچہ کو یہ رزق اس کے منہ کے ذریعہ نہیں بلکہ اس کی ناف سے دیا جاتا ہے،سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ایسا انتظام کیوں کیا ہے؟ جبکہ اس کے پاس منہ بھی ہوتا ہے،مگر منہ کے بجائے ناف سے کیوں اس کو غذا پہنچائی جاتی ہے؟

ان بزرگ نے فرمایا کہ بچہ کو ناف کے ذریعہ رزق پہنچانا اور زبان سے نہ پہنچانا،اس میں یہ حکمت رکھی ہے کہ بچہ کو جو غذا وہاں دی جاتی ہے وہ دراصل وہ خون ہے جو عورت کو ماہوار نکلتا ہے،اب رحم میں بچہ آنے کے بعد اللہ تعالیٰ اسی خون کو اپنی قدرت کاملہ سے اس کی غذا بنادیتے ہیں،اور یہ سب کو معلوم ہے کہ خون ناپاک اور گندہ ہوتا ہے،اگر اس کو وہ خون منہ سے دیا جاتا تو زبان ناپاک اور گندی ہوجاتی،اور زبان کو اللہ نے اپنے ذکر کے لیے بنایا ہے،تو پہلے ہی سے اللہ نے اس کی اس طرح حفاظت فرمائی کہ اس کو رحمِ مادر میں بھی ناپاک خون سے محفوظ رکھا۔اس وجہ سے جس

زبان سے اللہ کا ذکر ہو، اللہ کا نام لیا جاتا ہو وہ زبان گندی نہ ہو جائے، وہ فرماتے ہیں کہ اس لئے اللہ نے اس کے رزق کا انتظام زبان کے بجائے دوسری جگہ یعنی ناف سے کیا۔

میں کہتا ہوں کہ اب ذرا غور کیجئے کہ آج زبان کو کتنا گندہ کیا جاتا ہے، ایک طرف اس سے گالیاں دی جاتی ہے، اور دوسری طرف اسی زبان سے قرآن پڑھا جاتا ہے، ایک طرف اس سے چغلی کھائی جاتی ہے، اور دوسری جانب اسی سے حدیثِ پاک پڑھی جاتی ہے، ایک طرف اس سے غیبتیں کی جاتی ہیں پھر اسی زبان سے اللہ کو یاد کیا جاتا ہے، یہ کتنی بے ادبی کی بات ہے، اللہ تعالے نے تو رحمِ مادر میں بھی ہماری زبان کی ناپاک خون سے حفاظت کی اور ہم یہاں آکر اس کو ہر طرح کی گندگی سے آلودہ کر لیتے ہیں۔

ایک بزرگ نے فرمایا کہ اگر میں سو بار بھی اپنی زبان کو مشک وعنبر سے دھوؤں، تب بھی اس زبان سے اللہ کا نام لینا کمالِ بے ادبی ہے، دیکھا بھائی! اللہ کے نام کا کتنا احترام ہے ان کے نزدیک، اور ایک ہم ہیں کہ اپنی زبانوں کو گندہ کرتے رہتے ہیں، پھر اسی زبان سے اللہ کا نام بھی لیتے ہیں، کیا اللہ کا نام اتنا آسان ہے کہ ہم اپنی گندی زبان سے اس کو لیں، اللہ جیسا پاکیزہ نام، اور یہ بے ادبی؟ جب ادنی سے ادنی کا نام احترام سے لیا جاتا ہے تو پھر اللہ کے نام کا کتنا اور کیسا احترام ہونا چاہئے تھا؟

ماءِ مستعمل ناپاک کیوں ہے؟

حدیث میں آتا ہے کہ جب آدمی وضو کرتا ہے اور پورے آداب کی رعایت کے ساتھ کرتا ہے، تو اس کے تمام اعضاء سے حتیٰ کہ ان کے ناخنوں کے پوروؤں سے

بھی گناہ جھڑتے اور نکل جاتے ہیں۔ (ترمذی شریف:۲)

معلوم ہوا کہ وضو کے اعضاء سے وضو کرنے والے کے گناہ جھڑتے ہیں اور یہ اس پانی کے ساتھ نکلتے ہیں جو وہ وضو میں استعمال کرتا ہے، یہ کتنی بڑی فضیلت ہے وضو کی، اور مومن کے لیے کس قدر سامانِ تسلی ہے اس میں!

اب یہیں سے ایک فقہی مسئلہ بھی حل کرتے چلیں، وہ یہ کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے ماء مستعمل کو اپنی ایک روایت میں ناپاک قرار دیا ہے، اس حدیث سے اس مسئلہ کی تائید ہوتی ہے کیونکہ گناہ ایک باطنی گندگی ہے، جب وہ گندگی وضو کے پانی کے ساتھ مل جاتی ہے تو اس پانی کو بھی ناپاک کر دیتی ہے۔

ایک بہت بڑے عالم علامہ عبدالوھاب شعرانیؒ جو کہ شافعی تھے، وہ فرماتے ہیں کہ امام اعظم کو لوگوں کے حالات منکشف ہو جایا کرتے تھے، اور جب لوگ وضو کرتے تو ان کے اعضاء سے نکلا ہوا پانی جب گرتا تھا تو اس میں امام صاحب کو گناہ کے جراثیم نظر آ جاتے تھے، اس لئے امام صاحب نے اس مستعمل پانی کو نجاست غلیظہ کہا، اور امام صاحب سے ایک اور روایت یہ ہے کہ یہ مستعمل پانی نجاستِ خفیفہ ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ وضو کا جو پانی اعضاء سے نکلتا ہے گویا کہ وہ ناپاک ہے۔

اس فقہی مسئلہ سے ایک سلوک کا مسئلہ عرض کرتا ہوں کہ جب امام صاحبؒ گناہ سے ملے ہوئے پانی کو ناپاک قرار دے رہے ہیں تو اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ امام صاحب کے نزدیک گناہ بڑی ناپاک چیز ہے، اور اس کے ناپاک ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حدیث میں ہے کہ جب کوئی جھوٹ بولتا ہے تو اس کے پاس سے فرشتے بھاگ جاتے ہیں کیونکہ اس کے جھوٹ سے ان کو بدبو آتی ہے۔

(ترمذی شریف:۱۸۹۵)

بھائیو! اس لئے گناہوں سے بے انتہاء اجتناب ضروری ہے، تاکہ ہم گندگی وآلودگی سے محفوظ رہیں۔

سالک کا کام کیا ہونا چاہیے؟

مولانا روم علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ راہ سلوک کے مسافر کو تین کاموں میں سے ایک کام ضرور کرنا چاہئے، پہلا اور سب سے اہم کام یہ کہ اخلاق رذیلہ کو یکسر اپنے قلب سے اُکھاڑ پھینکے، جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے درِ خیبر کو اُکھاڑ کر پھینک دیا تھا، جس سے خیبر کا زبردست قلعہ فتح ہو گیا تھا، اسی طرح باطنی فتوحات کے لئے ضروری ہے کہ رذائل اخلاق کو دل سے بیک وقت ختم کر کے رکھ دے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ باطنی فتوحات کے لیے قلب کا اخلاق رذیلہ سے پاک کرنا ضروری ہے۔

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی سالک پست ہمتی کی وجہ سے یہ کام نہ کر سکے تو دوسرا کام سالک کا یہ ہے کہ وہ رذائل کو ختم کرنے کی کوشش میں لگ جائے، یہ کوشش میں لگنا ہی فتوحات باطنیہ قرار پائے گا، جیسے خیبر کے موقعہ پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ وعمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کیا کہ ان کے ہاتھ سے درِ خیبر اُکھڑ نہ سکا، مگر وہ برابر اس کے اُکھاڑنے کی کوشش میں تھے، اور اسی لیے ان کو شریکِ جہاد مانا گیا۔ اسی طرح جو رذائل اخلاق کے اُکھاڑنے اور ان کو ختم کرنے میں کوشاں ہوگا، وہ باطنی جہاد میں شامل اور فتح میں شریک قرار دیا جائے گا، یہاں مراد جہاد اکبر ہے، جیسے غزوہ جہاد اصغر ہے۔

مولانا رومؒ نے فرمایا کہ جو سالک اتنا کمزور وضعیف ہو اور پست ہمت ہو کہ یہ کام بھی نہ کر سکے تو ایسے سالک کے لئے ایک تیسرا کام ہے، مولانا رومی نے ضعیف

و پست ہمت سالکین کے لیے یہ کام تجویز فرما کران کو بھی جہاد میں حصہ دار بنا دیا، وہ یہ کہ کسی کامل کی صحبت وخدمت میں رہنے کی زحمت گوارا کرے،مولانا نے اس کو عجیب تمثیل سے واضح کیا ہے کہ جیسے کانٹا کہ اس کو اگر الگ نہ کیا جا سکتا ہو،تو اسکو پھولوں کے ساتھ ملائے رکھتے ہیں،اور یہ کانٹا بھی محبوب ہو جاتا ہے،اور جب پھول چننے والے،اور پھول کو آنکھوں اور دل سے لگانے والے، پھول چنتے اور لیتے ہیں تو اس کانٹے کو بھی لیتے ہیں اور آنکھوں اور دل سے لگاتے ہیں،فرمایا کہ اسی طرح جو سالک اپنے رذائل کو ختم نہ کر سکے اور نہ اس اسکی کوشش ہی کر سکے تو کم ازکم کسی کامل ومحبوب کی صحبت وخدمت میں رہ جائے،جس سے اتنا فائدہ تو ہوگا کہ محبوب کے ساتھ یہ بھی محبوب ہو جائے گا،اگر چہ کہ مراتب میں فرق وتفاوت ہوگا اور ہونا بھی چاہیے، تاہم یہ بھی فائدہ عظیمہ ہے۔

جیسی زندگی ویسی موت

فرمایا کہ اللہ کا قانون یہی ہے کہ جیسی زندگی ہوتی ہے ویسی ہی موت آتی ہے،اسی لئے ایک جگہ اللہ تعالی نے فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ٥

اے ایمان والو!اللہ سے ڈرو جیسا کہ ڈرنا چاہئے اور ہرگز نہ مرو،مگر مسلمان ہو کر۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرنے کی حالت تو ہمارے اختیار میں نہیں ہے، پھر کیوں کر اسلام کی حالت میں مرنے کا حکم دیا جارہا ہے؟مفسرین نے اس کا جواب دیا ہے کہ اسلام پر مرنا تو ہمارے اختیار میں نہیں ہے،مگر اسلام پر جینا تو ہمارے اختیار میں ہے، جو اسلام پر جیتا رہے گا، وہ اسلام پر مرے گا، جو ذکر پر جیئے گا، وہ ذکر پر

مریگا، جو دنیا پر جیئے گا، وہ دنیا پر ہی مرے گا۔

حضرت مسیح الامتؒ کی وفات کا واقعہ

فرمایا کہ مرشدی حضرت مسیح الامت شاہ مسیح اللہ خان صاحبؒ کی وفات کا عجیب واقعہ ہے، حضرت کی وفات سے ایک ماہ پہلے بندہ ملاقات واستفادہ کے لئے گیا تھا، اور کچھ ایام حضرت والاؒ کی خدمت میں گزار کر آیا تھا، اس وقت حضرت کو نہایت ہی ضعف و نقاہت تھی، مصافحہ کیلئے ہاتھ اُٹھانے کی بھی طاقت نہیں تھی، میرے واپس آنے کے پندرہ دن بعد حضرت والاؒ کا انتقال ہوگیا، ہوا یہ کہ جس رات حضرت والا کا انتقال ہوا، اُس وقت وہاں میرے ساتھی مولانا عنایت اللہ لندنی موجود تھے، وہی حضرت کے خادم بھی تھے، مجھے اُن کی یہ روایت پہنچی کہ رات وہ سو چکے تھے، حضرت والاؒ بھی سو چکے تھے، وہ فرماتے ہیں کہ رات میں مجھے اچانک محسوس ہوا کہ ذکر کی آواز آرہی ہے، اُٹھ کر دیکھا تو حضرت خود بخود اُٹھکر بیٹھے ہیں، ذکر بالجہر میں مشغول ہیں، جبکہ ہاتھ اُٹھانا بھی مشکل تھا، خود اُٹھ کر بیٹھنا تو خارج از سوال تھا، یہ حضرات پریشان ہوکر حضرت کو پکارنے لگے اور اپنی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی مگر متوجہ نہ ہوئے، گویا اِدھر کا خیال ہی نہیں تھا، تقریباً ایک گھنٹہ اسی طرح ذکر جاری رہا، اور اسی حالت میں ذکر کرتے کرتے ہی وصال ہو گیا۔

بھائیو! جیسی زندگی ہوتی ہے ویسی ہی موت آتی ہے، جس کی اللہ کی یاد میں زندگی گزرتی ہے، اس کی موت بھی اسی کی یاد میں آتی ہے، یہ اللہ والے ہمیشہ اللہ کی یاد میں ہوتے ہیں تو موت بھی اللہ ہی کی یاد میں آتی ہے۔

ایک بزرگ کی موت کا واقعہ

اسی پر ایک اور واقعہ یاد آیا، حضرت اقدس مولانا شاہ ابرار الحق صاحبؒ کے ایک خلیفہ قادر معظم صاحب جو فیض العلوم، حیدرآباد میں مدرس تھے، ان کی موت کا واقعہ عجیب ہے، وہ یہ کہ ایک مرتبہ ان کے علاقہ کے حالات خراب تھے، کرفیو تھا، دوچار دن بعد کرفیو میں ڈھیل دی گئی، تو قادر معظم صاحب طلبہ کو دیکھنے مدرسہ جارہے تھے، درمیان میں کچھ غنڈوں نے گھیر لیا اور قتل کرنے کے درپے ہوگئے، تو حضرت نے فوراً رومال بچھا کر نماز پڑھنا شروع کردیا، جب سجدہ میں گئے تو دشمنوں نے قتل کردیا اور روح قبض ہوگئی۔

دیکھئے موت کے وقت اللہ کی یاد آجانا دلیل ہے کہ زندگی بھی اللہ کی یاد میں گزری ہے، اگر اللہ کی یاد میں زندگی نہ گزاری ہوتی تو موت بھی اللہ کی یاد میں نہ آتی۔

شقاوت و بدبختی کی علامت

علامہ قشیری نے ''الرسالہ'' میں محمد بن الفضل البلخیؒ سے نقل کیا ہے کہ ان سے ابوعثمان الحیری نے پوچھا کہ بدبختی کی علامت کیا ہے؟ تو فرمایا کہ تین باتیں شقاوت و بدبختی کی علامت ہیں، ایک یہ کہ علم دیا جائے مگر عمل سے محروم کردیا جائے، دوسرے یہ کہ عمل کی توفیق دی جائے مگر اخلاص نصیب نہ ہو، تیسرے یہ کہ اولیاء وصالحین کی صحبت ملے مگر ان کا احترام نصیب نہ ہو۔

میں کہتا ہوں کہ سالک کو مذکورہ بات ذہن نشین رکھنا چاہئے، اور علماء حضرات کو بھی اس پر غور کرنا چاہئے، کوئی عالم ہو جائے مگر عمل نہ کرے یہ بھی بدبختی

ہے، اور کوئی عمل تو کرے مگر مقصد و نیت غیر خدا ہو، اخلاص حاصل نہ ہو، تو یہ بھی بد بختی ہے، اور صالحین کی صحبت و معیت نصیب ہو اور ان کی قدر کر کے، ان سے کچھ حاصل نہ کرے تو یہ بھی بڑی ہی محرومی اور بد بختی کی علامت ہے، سالکین کو شیطان جن ذرائع سے بہکاتا ہے اور محرومی و بد بختی میں مبتلا کرتا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ صحبت کاملین کے باوجود، ان کی ناقدری میں مبتلاء کر دیتا ہے، اور یہ فیض سے محروم کر دینے والی بات ہے۔

ایک بزرگ کا استحضارِ موت، ایک واقعہ

استحضار موت کا ذکر چل رہا تھا، اس پر یہ فرمایا کہ ایک بزرگ جنگل میں رہتے تھے، ان کے پاس ایک بادشاہ ملاقات کے لیے گیا، دیکھا کہ وہاں کھانے پینے کا کوئی سامان نہیں ہے، گفتگو ہوئی، واپسی کے وقت بادشاہ نے پوچھا کہ حضرت! آپ کے کھانے کا کیا نظام ہے، آپ اس جنگل میں کیا کھاتے ہیں؟

حضرت نے فرمایا کہ میرے پاس کچھ گولیاں ہیں، جن کو کھا لیتا ہوں، جو مجھے کافی ہو جاتی ہیں، چاہو تو تم بھی لے جاؤ، یہ کہہ کر چند گولیاں بادشاہ کو بھی دیدیں، جب بادشاہ نے یہ گولیاں کھائیں، تو ایسا محسوس ہوا کہ جسمانی اور باہی طاقت وقوت میں اضافہ ہو گیا ہے، عورتیں ناکافی ہو رہی ہیں، ایک رات میں کئی کئی عورتوں سے ملاقات کرنے کی ضرورت پڑ رہی ہے، بادشاہ کے دل میں یہ خیال آیا کہ ان گولیوں سے اتنی قوت آجاتی ہے کہ مجھے میری عورتیں ناکافی ہو رہی ہیں، تو ان بزرگ کا کیا حال ہوگا جو صرف یہی گولیاں کھاتے ہیں، ان کے پاس کتنی عورتیں آتی ہونگیں؟ دماغ میں ایک وسوسہ آیا، پھر وہ بادشاہ دوبارہ ان بزرگ صاحب کے پاس ملنے کے لیے گیا، کبھی اللہ کی طرف سے اللہ والوں کو لوگوں کے خیالات و وساوس کی

اطلاع دیدی جاتی ہے،تو ان بزرگ کو بھی بادشاہ کے خیال پر مطلع کردیا گیا، چنانچہ انہوں نے اس بادشاہ سے پوچھا کہ کیا آپ نے وہ گولیاں کھالی تھیں؟ کیا حال رہا؟ کہا کہ حضرت واقعی بہت عجیب وغریب گولیاں ہیں، کھانا پینا سب اُسی میں ہے، بزرگ نے کہا کہ جی چاہتا ہے کہ اور کچھ گولیاں دوں، یہ لے جائیے،مگر یادرہے کہ چالیس دن میں آپ کا انتقال ہوجائے گا،بس یہ سنتے ہی اُس کی حالت خراب وخستہ ہوگئی، وہیں سے لوگوں کو اسے اُٹھا کرلانا پڑا،اور جوں جوں دن گزرتے جارہے تھے، حالت ابتر ہوتی جارہی تھی، دماغ ٹھکانے پرنہیں ہے، ہاتھ پیر کام نہیں کر رہے ہیں، سارے درباری اور گھر والے پریشان ہیں، وہ گولیاں بھی کھالیا کہ کچھ حالت بحال ہومگراب کسی غیرعورت کا تو کیا خیال آتا، اپنی بیویوں کا بھی خیال نہیں آرہا ہے،اور جب چالیسواں دن آیا تو مت پوچھو کہ کیا حال ہوا،موت کا انتظار ہورہا ہے کہ نہ معلوم عزرائیل کس وقت اور کہاں سے آجائیں، بڑی مشکل سے دن کٹا،مگر موت نہیں آئی، اور نہ فرشتہ نظر آیا، پھر دو چار دن اور انتظار کرنے کے بعد بھی موت نہیں آئی،تب اس کی حالت میں کچھ کچھ سدھار آیا اور بادشاہ پھر ان بزرگ سے ملنے کے لیے گیا، کہ پوچھوں کہ قصہ کیا ہے؟ بزرگ نے بادشاہ کو دیکھ کر خیریت دریافت کی، اس نے کہا کہ حال کیا پوچھتے ہو؟ میں تو بے حال ہوں، مرا تو نہیں، مگر حالت مرنے سے زیادہ خراب ہوگئی، بزرگ نے فرمایا کہ بھائی! آپ کو تو چالیس دن کی مہلت بتائی تھی، آپ کو ان چالیس دنوں میں ان گولیوں کے کھانے کے باوجود اِدھر اُدھر کا خیال نہیں آیا، اور ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہر وقت ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اب موت آئے گی، اب اللہ کا فرشتہ آئے گا،تو کیا ہمارا خیال کسی ایرے غیرے کی طرف جائے گا؟ ہم تو اللہ کے پاس جانے تیار بیٹھے ہیں،تو ہم کو غلط خیال کیسے آسکتا ہے؟

اس سے معلوم ہوا کہ استحضار موت اگر کسی کو نصیب ہو تو اس سے خود بخود گناہ چھوٹ جاتے ہیں۔اس لیے اس کا اہتمام کرنا چاہئے کہ موت کا استحضار پیدا ہو جائے۔

آخرت کے عمل میں نیت کی کمزوری

آج ہم لوگ آخرت کے اعمال تو بجا لا رہے ہیں ،مگر عمل میں نیت کی کمزوری ہے، یعنی اخلاص کا فقدان ہے ، جس کی وجہ سے سارے اعمال ضائع ہو رہے ہیں،ایک بزرگ تھے وہ تکبیر اولی کا بڑا اہتمام کرتے تھے،ایک مرتبہ ان کی ایک رکعت چھوٹ گئی ،تو وہ امام کے سلام کے بعد اپنی نماز پڑھ رہے تھے، سارے لوگ ان کو دیکھنے لگے کہ ان کی آج ایک رکعت چھوٹ گئی،تو لوگوں کے دیکھنے کی وجہ سے ان کو شرم آئی ، پھر وہ بزرگ ساری زندگی کی نمازیں دھرانے لگے، پوچھا گیا تو فرمایا کہ لوگوں کے دیکھنے سے مجھے شرم آئی ،معلوم ہوا کہ میری توجہ خالق کی طرف نہیں ، بلکہ مخلوق کی طرف ہے،تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے اب تک بھی جو نمازیں پڑھی ہیں ، وہ مخلوق کے لئے پڑھی ہیں ، اللہ کے لئے نہیں پڑھی ،اس لئے ساری نمازیں دھرا رہا ہوں۔

غور کیجئے کہ یہ بزرگ تیس سال کی نمازیں دھرا رہے ہیں ، یہ سمجھکر کہ میری نیت میں کمزوری ہے،اس طرح کبھی نیت میں فتور پیدا ہو جاتا ہے، اس لئے اپنی نیتوں کو خالص بنانے کی فکر کرنا چاہئے ، ورنہ سب کچھ کیا کرایا پانی میں چلا جاتا ہے۔

استحضارِ موت کے لیے مراقبہ

فرمایا: اللہ والے فرماتے ہیں کہ روزانہ کچھ وقت مقرر کر کے موت کا مراقبہ

کرنا چاہئے، اس سے موت کا استحضار پیدا ہوگا اور یہ گناہوں سے بچنے کی آسان تدبیر ہے، خلوت میں بیٹھ کر یہ سوچے کہ میں بھی ایک دن مرجاؤں گا، مجھے بھی غسل دیا جائے گا، کفن پہنایا جائے گا، پھر قبرستان لے جایا جائے گا، پھر لوگ مجھے قبر میں اتاریں گے، میرے اوپر مٹی ڈالیں گے، مجھے تن تنہا قبر کی اندھیریوں میں چھوڑ کر آجائیں گے، پھر مجھ سے سوالات ہوں گے، مجھے ہر ہر چیز کا حساب دینا ہوگا، اللہ کے سامنے پیشی ہوگی، نہ معلوم میرا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، یا بائیں ہاتھ میں، سالک ایسا مراقبہ روزانہ کرے تو ہمیشہ موت کا استحضار رہے گا۔

ایام خالیۃ کی دو تفسیریں

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ﴾ (مزے لیکر کھاؤ اور پیو گذرے ہوئے دنوں میں جو کچھ نیک اعمال کئے ہیں ان کے بدلے میں) علماء نے ایام خالیۃ کی دو تفسیریں کی ہیں: خالیۃ کے ایک معنی ماضیۃ (یعنی گذرے ہوئے) کے ہیں، یعنی دنیا میں تم نے ہمارے حکم کے مطابق جو دن گذارے ہیں اس کے بدلے میں کھاؤ اور پیو، دوسری تفسیر یہ ہے کہ دنیا میں کچھ ایام تم نے خالی خالی گذارے ہیں، شہوات سے خالی، لذات سے خالی، تمناوں سے خالی، نفسانی خواہشات سے خالی، تمہاری مرضی کی زندگی تم نے نہیں گذاری، اس لئے جنت میں کھاؤ اور پیو۔

لہذا جو یہاں دنیا میں اپنے ایام نفسانی خواہشات سے خالی گزارے گا، اور دنیا کی فانی نعمتوں کو اللہ کے لیے قربان کردے گا، اس کو وہاں کی عظیم اور فنا نہ ہونے والی نعمتیں عطا کی جائیں گی۔

ایک دلہن سے عبرت

فرمایا کہ ایک لڑکی کی شادی ہونے والی تھی، چنانچہ اس کو سجایا گیا، کپڑے پہنا ئے گئے، زیور پہنایا گیا، اور سارے لوگ، رشتہ دار، سہیلیاں، دوست احباب اسے دیکھ کر خوش ہونے لگے، اور کہنے لگے کہ ما شاء اللہ ! کتنی اچھی لگ رہی ہے، کیا خوبصورت لگ رہی ہے۔ سب اس کے حسن و جمال کی تعریف کرنے لگے، اور سب رشتہ دار و دوست احباب خوشی کا اظہار کررہے تھے، مگر اس لڑکی کے چہرہ پر اُداسی چھائی ہوئی تھی، وہ غمزدہ تھی، اس سے پوچھا گیا کہ کیا بات ہے کہ تو خوش نہیں ہے؟ تو اس لڑکی نے عجیب جواب دیا، کہنے لگی کہ تم سب تو مجھ سے خوش ہو اور میرے حسن و جمال کی تعریف کررہے ہو، مجھے پسند کررہے ہو، مگر میں اس فکر میں ہوں کہ جس کے لئے مجھے سنوارا جارہا ہے، یعنی میرا شوہر، اگر وہ مجھے پسند نہ کرے تو میرا کیا ہوگا ؟ مجھے یہ فکر دامنگیر ہے، جس کی وجہ سے میں غمزدہ ہوں، ایک بزرگ نے یہ واقعہ سنا کر کہا کہ اس لڑکی کو جس قدر احساس تھا ہمیں وہ اللہ کے بارے میں حاصل ہو جائے تو ہماری آخرت سنور جائے، ہم یہ سوچیں کہ ہم سے ہمارا خالق و مالک راضی ہو، ہم دوسروں کے خوش ہونے پر خوش ہوجاتے ہیں، یہ نہیں دیکھتے کہ ہم سے اللہ تعالےٰ بھی خوش ہیں کہ نہیں؟ لہذا ہم کو یہ خیال کرنا چاہئے کہ اگر ساری دنیا ہماری عبادت سے خوش ہو جائے، ہمارے علم سے خوش ہوجائے، ہمارے کسی کردار سے خوش ہوجائے، مگر خدا تعالیٰ ہماری عبادت وریاضت کو پسند نہ کرے اور کہدے کہ تیری عبادت مجھے پسند نہیں تو کیا ہوگا ؟ اس لئے دنیا والوں کی تعریف پر خوش نہیں ہونا چاہئے، ہمیں تو اللہ کو خوش کرنا ہے، اللہ خوش ہوجائے تو پھر ساری دنیا ناراض ہو تو بھی کوئی حرج نہیں۔

دنیادار کون ہے؟

ایک مجلس میں فرمایا کہ آج لوگ سمجھتے ہیں کہ جس کے پاس مال ہے وہ دنیادار ہے، یہ بات غلط ہے، اس لئے کہ اسی مال کو اللہ کے راستہ میں خرچ کر کے انسان بڑا اللہ والا بن سکتا ہے، اسی لئے ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ ''چیست دنیا''؟ دنیا کسے کہتے ہیں، تو انہوں نے جواب دیا کہ ''از خدا غافل بودن''، یعنی دنیا اللہ سے غافل ہونے کو کہتے ہیں، یہ نہیں کہا کہ دنیا مال کا نام ہے، کپڑے کا نام ہے، بلڈنگ کا نام ہے، زیور کا نام ہے، سونے چاندی کا نام ہے، بلکہ فرمایا کہ اللہ سے غافل ہونے کا نام دنیا ہے، معلوم ہوا کہ ایک آدمی کروڑ پتی ہے، مگر وہ اللہ سے غافل نہیں، اللہ کے احکام پر اس کی زندگی ہے، اس کے اعضاء اطاعت و بندگی میں لگے ہوئے ہیں، اس کا مال اللہ کے راستہ میں خرچ ہو رہا ہے، تو وہ کروڑ پتی ہونے کے باوجود دنیا دار نہیں، اور ایک آدمی کے پاس بالکل مال نہیں، بھکاری ہے، فقیر ہے، نہ کپڑے ہیں، نہ کھانا ہے، لیکن اس کے باوجود دنیا کی محبت دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری نہیں کرتا، بلکہ اللہ کے احکام کو دن رات پامال کرتا رہتا ہے، تو یہ فقیر بہت بڑا دنیا دار ہے۔

معلوم ہوا مال ہونے یا نہ ہونے سے دنیا داری کا کوئی تعلق نہیں، ایک آدمی کروڑ پتی ہونے کے باوجود دیندار ہوسکتا ہے، اور ایک آدمی فقیر ہونے کے باوجود دنیا دار ہوسکتا ہے۔

نیم شب کی دولت

فرمایا کہ راتوں میں اُٹھ کر اللہ کی عبادت کا جو لطف و مزہ ہے وہ کچھ اور ہی ہوتا

ہے،اوراس کا کیف ولذت عجیب ہوتی ہے،اور جن کو یہ دولتِ نیم شبی مل جاتی ہے،ان کی نظر میں دنیا ہیچ در ہیچ ہو جاتی ہے،اسی لیے اولیاءاللہ کو دنیا ہیچ نظر آتی ہے،اس پر ایک واقعہ یاد آیا کہ حضرت شیخ المشائخ عبدالقادر جیلانی نوراللہ مرقدہٗ کے زمانہ کا جو بادشاہ تھا،اُسکو معلوم ہوا کہ حضرت کے دستر خوان پر روزانہ ایک ہزار آدمی کھانا کھاتے ہیں، مہمانوں کی بھرمار ہوتی ہے،لوگ اُن کے پاس اللہ کی معرفت ومحبت لینے آتے ہیں، ذکر سیکھنے آتے ہیں،تو اُس نے سوچا کہ حضرت اتنی بڑی خدمت کرتے ہیں،تو اُن کیلئے میری حکومت کا آدھے حصہ کا خراج دیدینا چاہئے،تا کہ اُس کی آمدنی سے یہ لوگوں کی خدمت کریں،چنانچہ حضرت کو اس نے خط لکھا،اس میں لکھا کہ حضرت! میں آپ کے لئے میری نیم روز حکومت کا آدھا حصہ وقف کرنا چاہتا ہوں،اس کو قبول کیجئے،حضرت عبدالقادر جیلانیؒ نے اس خط کی پشت پر جواب لکھ کر بھیج دیا کہ اللہ نے جب سے نیم شب کی دولت دی ہے،نیم روز کی کوئی ہوس نہیں رہی،نیم شب کیا ہے؟ رات میں اٹھکر اللہ کو یاد کرنا،اس کے سامنے گڑگڑانا،اس کی لذت جسے مل جاتی ہے،اسے ہفت اقلیم کی سلطنت بھی بیکار نظر آتی ہے۔

گناہ ظلمت ہے

ایک مجلس میں حضرت والا نے فرمایا کہ آدم علیہ السلام کو اللہ نے جنت میں ہر چیز کے کھانے کی اجازت دی،مگر ایک درخت کے قریب جانے سے منع کیا،لیکن آدم علیہ السلام شیطان کے بہکاوے میں آکر شجر ممنوعہ کھا بیٹھے،تو ان کے بدن سے جنت کا نورانی لباس اتار لیا گیا۔لہٰذا معلوم ہوا کہ جہاں نور رہوتا ہے وہاں ظلمت نہیں ہوتی، جہاں ظلمت ہو وہاں نور نہیں رہ سکتا،فرمایا کہ جب اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام سے صرف ایک گناہ سے نورانی لباس نکال لیا تو سوچو کہ جو لوگ گناہ پر گناہ کرتے ہیں تو

ان کے پاس نور کہاں رہے گا، جو نور نماز، روزہ، ذکر سے آیا تھا وہ گناہ کرنے سے ختم ہو جاتا ہے۔

نیک جذبہ مہمان ہے

حضرت اسماعیل شہیدؒ نے فرمایا کہ مومن کے دل میں نیکی کا جذبہ آئے تو یوں سمجھو کہ مہمان آیا ہے، اس کی عزت، خاطر مدارت اور استقبال کرنا چاہئے، جیسے کسی مہمان کے آنے پر کرتے ہیں، اگر گھر میں آنے والے مہمان کی تعظیم وتکریم نہ کی گئی تو وہ پھر کبھی نہیں آئے گا، اسی طرح اگر کوئی اس مہمان کی مہمان نوازی نہیں کرے گا، تو وہ پھر کبھی نہ آئے گا، اگر آپ اس کی عزت کریں گے تو وہ مہمان آتا رہے گا، جتنا اس کی مہمان نوازی کرو گے اتنا ہی وہ آپ کے پاس آتا رہے گا۔

اس اللہ کے مہمان کی خاطر مدارات وعزت کیا ہے؟ یہ ہے کہ اس نیک جذبہ پر عمل شروع کر دیا جائے۔ مثلاً نماز کا جذبہ آیا تو فوراً نماز پڑھنا شروع کر دے، ذکر کا جذبہ آیا تو ذکر شروع کر دے، صدقہ کا جذبہ آیا تو صدقہ دیدے۔

گنہ گاروں کے لئے سامان تسلّی

انسان گناہ کرنے سے ناپاک ونجس ہو جاتا ہے اور اس نجاست کو پاک کرنے کا طریقہ توبہ وہ استغفار ہے، حدیث میں ہے: ''**التائب من الذنب کمن لا ذنب له**'' (توبہ کرنے والے والا ایسا ہے، جیسا کہ اس نے گناہ کیا ہی نہ ہو) مگر بعض جاہل لوگ توبہ واستغفار کرنے سے گھبراتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم اتنے ناپاک ونجس ہیں، اللہ تعالی کی محترم ومقدس جناب میں کس طرح جائیں؟ یہی خیال ان کو توبہ سے محروم کر دیتا ہے یہ بڑی سخت بات ہے، مولانا روم نے ایک تمثیلی حکایت

لکھی ہے کہ ایک آلودۂ نجاست کپڑے سے پانی نے کہا کہ تو ناپاک ونجس ہو گیا ہے، جلدی سے میرے اندر آجا، میں تجھ کو پاک وصاف کر دوں گا، اس پر ناپاک ونجس کپڑے نے کہا کہ مجھے پانی سے شرم آتی ہے کہ پانی تو ایسا صاف وپاک اور میں اس قدر گندہ وناپاک، چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک، بھلا میں کس منھ سے پانی میں جاؤں؟ اس پر پانی نے کہا اور واقعی بالکل سچ کہا کہ اگر تو مجھ سے شرم کر کے میرے پاس نہ آیا تو تیرے پاک ہونے کی کوئی صورت نہیں بغیر مجھ سے ملے نجاست کے زائل ہونے کا کوئی مطلب نہیں، واقعی نجاست کے دور کرنے اور پاک کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ پانی میں غوطہ لگائے، کوئی شخص شرم کرتا ہوا پانی کے پاس نہ گیا تو وہ کبھی نجاست سے چھٹکارہ نہیں پا سکتا، بالکل اسی طرح باطنی نجاست وگندگی سے رہائی وصفائی کا طریقہ یہی ہے کہ اللہ کی طرف لپکے اور اس کے دریائے رحمت کے پاک و صاف پانی میں غوطہ لگائے اور اس سے توبہ واستغفار کرے۔ اللہ سے شرم کر کے اس کی جناب میں نہ جانا اور توبہ واستغفار نہ کرنا بڑی حماقت ہے، جیسے نجاست آلودہ کا پانی سے شرم کرنا حماقت ہے، مولانا روم فرماتے ہیں:

آب گفت آلودہ را در من شتاب
گفت آلودہ کہ دارم شرم از آب

پانی نے آلودۂ نجاست سے کہا کہ جلدی سے میرے پاس آجا، تو وہ آلودۂ نجاست کہنے لگا کہ پانی سے مجھے شرم آتی ہے۔

گفت آب این شرم بے من کے رود
بے من آلودہ زائل کے شود

پانی نے اس کے جواب میں کہا کہ میرے پاس آئے بغیر تیری یہ شرم کیسے ختم

ہوسکتی ہے؟ اور میرے بغیر یہ آلودگی کیسے زائل ہوسکتی ہے؟

آگے فرماتے ہیں:

ازآب ہرآلودہ گر پنہاں شود

الحیاء یمنع الایمان بود

یعنی اگر ہرآلودہ نجاست اسی طرح پانی سے شرم کرتے ہوئے چھپتا رہے گا تو یہ شرم بجائے ''الحیاء من الایمان'' ہونے کے ''الحیاء یمنع الایمان'' ہوجائے گی، معلوم ہوا کہ ایسی شرم وحیا مذموم ہے، جس سے ایمان کو بھی خطرہ ہے، یہاں تو بے شرم ہوکر خدا کے دربار میں حاضر ہوجانا اور معافی مانگنا چاہئے۔

معرفت کی حقیقت

تخلیق انسان کا مقصد قرآن نے عبادت کو بتایا ہے، چنانچہ فرمایا کہ: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ﴾ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس جگہ عبادت کی تفسیر معرفت سے کی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ تخلیق انسان کا اصل مقصد معرفت خداوندی ہے اور ایک حدیث قدسی سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے (كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًّا فَأَرَدْتُ أَنْ أُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ) اس حدیث کے متعلق صوفیا نے فرمایا ہے کہ صحیح ہے، اور محدثین نے فرمایا کہ یہ الفاظ ثابت نہیں، ہاں اس کا معنیٰ صحیح ہے، جیسا کہ ملا علی قاری نے فرمایا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی تخلیق کا اصل مقصد معرفت ہے اور معرفت کے لفظی معنیٰ ہیں جاننا پہچاننا، اور مرادی معنیٰ یہ ہیں کہ اللہ کی ذات وصفات اور افعال کو اس طرح جاننا کہ ان اوصاف وافعال کا اثر بندے کے احوال وافعال واخلاق

پر ظاہر ہو۔

مثلاً اللہ کے جمال وکمال اور عطا ونوال کو دیکھ کر اللہ سے محبت ہو جائے ، کیونکہ یہ اوصاف محبت کی مقتضی ہیں ، چنانچہ دنیا میں بھی محبت ، انہی اوصاف پر مرتب ہوتی ہے ، جب خداوند تعالیٰ کے جمال وکمال کو جان و پہچان لیا تو اس کا اثر (محبت) ہونا بھی ضروری ہے ، اسی طرح اللہ کی صفتِ رحیمیت ورحمانیت کو جان کر اللہ سے اُمید ورجاء کا ہونا فطری بات ہے ، اسی طرح اللہ کی صفتِ جلال وقہر کو معلوم کر کے ، اس سے خوف کھانا ضروری ہے ، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کو جاننے کے بعد اس پر توکل واعتماد کا حاصل ہونا لابدی ہے ، وعلی ہذا القیاس دیگر اوصاف کا حال ہے ، الغرض خدا کے اوصاف وافعال کو اس طرح جان لینا کہ اس کا اثر جاننے والے پر ظاہر ہو ، اس کو معرفت کہتے ہیں۔

اگر محض اللہ کے اوصاف وکمالات کو جاننا ہوا تو یہ لغوی معرفت ہے ، اصطلاحی معرفت نہیں ، جو مطلوب ہے ، اسی سے محض عالم اور ایک عارف باللہ کے درمیان فرق معلوم ہو جاتا ہے کہ محض عالم ، قرآن وحدیث کے علم کی وجہ سے اللہ کے اوصاف وکمالات کو پورے دلائل کے ساتھ جانتا ہے ، مگر اس کا اثر اس میں ظاہر نہیں ہوتا ، کیونکہ وہ عارف نہیں ، اور عارف ان اوصاف کے اثرات سے متاثر ہوتا ہے ، اور اس میں محبت وخشیت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ عارف محض عالم نہیں ہوتا ، بلکہ وہ اپنے علم کے آثار واثرات کا حامل اور ان پر عامل بھی ہوتا ہے۔

ایک حدیث پر شبہ کا جواب

فرمایا کہ حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عادات میں آیا ہے (كَانَ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ أَحْيَانِهٖ) کہ آپ ہمہ وقت اللہ کا ذکر کرتے رہتے

تھے۔(مسلم:۳۷۳،سنن ترمذی:۳۳۸۴،صحیح ابن خزیمہ: ۱/۱۰۴،صحیح ابن حبان:۳/۸۱،مسندابوعوانہ:۱/۱۸۴)

اس پرعلمانے کلام کیاہے کہ یہاں ذکر سے کونساذکرمرادہے؟علماءنے فرمایا کہ اس سے مرادذکرقلبی ہے،نہ کہ ذکرلسانی،اورحضرات علماءکودراصل پریشانی یہ پیش آئی کہ بیت الخلاء جانے کےموقعہ پراوربعض ضروریات وحاجات کےموقعہ پرذکر لسانی ممنوع ہے کیوں کہ یہ اسم الٰہی کی اہانت کا موجب ہے، پھرآپ ہمہ وقت ذکر لسانی کیسے کرسکتے ہیں؟لھذاعلماءنے ذکرقلبی مرادلیاتاکہ یہ اشکال ختم ہوجائے۔

اس ناکارے کے ذہن میں ایک دوسری بات آتی ہے، وہ یہ کہ یہاں حدیث میں ذکر سے مرادقلبی کے ساتھ لسانی بھی ہے،یعنی صرف قلبی نہیں، بلکہ قلبی ولسانی دونوں مراد ہیں،اور مذکورہ شبہ کاحل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جمہورعلماءاورخصوصاائمہ اربعہ کامسلک یہ ہے کہ آپ کا فضلہ پاک ہے، جیساکہ اپنی جگہ اس کے دلائل مذکورہیں،اس بناءپراللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیت الخلاء والی حالت نجاست سے ملوث نہیں،لہذااس موقعہ پربھی آپ کے لئے ذکرلسانی ممنوع نہ تھا،اوردوسروں کے لئے ممنوع ہے، کیونکہ باقی سب لوگ اس موقعہ پرنجاست سے ملوث وآلودہ ہوتے ہیں،اورذکرلسانی کے اس موقعہ پرممنوع ہونے کی علت دراصل یہی تلوّث بالنجاسۃ ہے،بس جہاں یہ مفقودہےوہاں ذکرلسانی ممنوع بھی نہیں ہے۔

پھرغورکرنے کی بات ہے:''کان یذکر اللہ '' والاجملہ صحابہ کاقول ہے،اس میں ذکر سے ذکرلسانی ہی مرادہوناچاہئے،کیونکہ ذکرقلبی توکسی کےعلم میں نہیں آسکتا،جب علم میں نہیں آسکتاتواس کی خبروہ کیوں کرکردےسکتے ہیں؟معلوم

ہوا کہ یہاں وہ ذکر مراد ہے جس کا علم ہوسکتا ہے، اور وہ لسانی ہے نہ کہ قلبی، البتہ اس پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ بیت الخلاء والی حالت بھی تو صحابہ سے مخفی ہوتی تھی، تو اس کا جواب آسان ہے وہ یہ کہ بیت الخلاء میں آپ کا ذکر باللسان کرنا صحابہ کو معلوم ہوسکتا تھا، اس طرح کہ صحابہ اس موقعہ پر باہر جو انتظار میں رہتے تھے انہوں نے سنا ہو، اور صحابہ کے حالات اور ان کے شوق علم سے یہ بعید از قیاس نہیں، لہذا یہ بات ممکن ہے کہ مخفی ہونے کے باوجود ذکر لسانی معلوم ہو جائے۔

ہاں اس پر ایک قوی شبہ اس حدیث سے ہوسکتا ہے جس میں ہے کہ آپ نے ایک صحابی حضرت مہاجر بن قنفذؓ کے سلام کا جواب استنجاء سے فراغت کے بعد اس لیے نہیں دیا کہ آپ لفظ سلام جو کہ اللہ کا نام ہے اس حالت میں لینا نہیں چاہتے تھے۔

(مستدرک حاکم: ۱/۲/۲۷، صحیح ابن خزیمہ: ۱/۱۰۳، صحیح ابن حبان: ۳/۸۲، ابوداؤد: ۱۷)

اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ذکر لسانی سے اس حالت میں احتراز فرماتے تھے۔ مگر اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا آپ نے کبھی کبھی کیا ہے تاکہ افضلیت پر عمل ہو، ورنہ خود آپ سے اس کے خلاف بھی ثابت ہے، چنانچہ بخاری و مسلم وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک بار وہ اپنی خالہ حضرت میمونہؓ جو ازواج مطہرات میں سے ہیں ان کے گھر رسول اللہ کے ساتھ سو گئے، آدھی رات میں آپ بیدار ہوئے اور بیٹھ کر سورۂ آل عمران کی آخری دس آیات پڑھیں، پھر وضو فرمایا۔ (بخاری: ۱۳۷، مسلم: ۷۶۳) اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ آپ نے بغیر وضو اللہ کا کلام پڑھا اور اس میں اللہ کا نام تو ہے ہی۔

ہماری دعاء قبول نہ ہونے کا سبب

ایک شخص نے حضرت ابراھیم بن ادہمؒ سے عرض کیا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: أُدْعُونِيْ أَسْتَجِبْ لَكُمْ (مجھے پکارو میں جواب دوں گا) لیکن ہم دعا کرتے ہیں تو قبول نہیں ہوتی، اس کی کیا وجہ ہے؟ حضرت ابراھیم بن ادہمؒ نے فرمایا کہ اس کی وجہ پانچ باتیں ہیں:

۱-تم نے خدا کو پہچانا لیکن اس کا حق ادا نہیں کیا۔
۲-تم نے قرآن تو پڑھا مگر اس پر عمل نہیں کیا۔
۳-اور تم نے محبت رسول کا دعوی کیا لیکن ان کی سنت کو ترک کر دیا۔
۴-تم نے زبان سے ابلیس پر لعنت کی، لیکن عمل میں اس کی اطاعت کی۔
۵-تم نے اپنے عیوب کو چھوڑ دیا اور لوگوں کی برائیاں پکڑنے میں مشغول ہو گئے۔

دنیوی عیش باعثِ شرمندگی ہوگا، ایک واقعہ

فرمایا کہ ہندوستان کے مشہور شاعر اکبر الہ آبادی مرحوم، جو کہ انگریزی دور حکومت میں چیف جسٹس کے عہدے پر فائز تھے، ایک بار ان کے گھر پر ایک میٹنگ کے لیے بڑے بڑے لوگ جمع تھے اور ان کے والد بھی باحیات تھے، بوڑھے تھے، درمیان مشورہ ان کے والد اس کمرے میں جہاں میٹنگ ہو رہی تھی، آئے اور سلام کیا، اور اپنے ہاتھ میں غبارہ (جس کو ہمارے علاقہ میں عوام الناس انڈا کہتے ہیں) جو کھلونہ ہے، لے کر آئے اور اپنے صاحبزادے اکبر الہ آبادی کے ہاتھ میں دیکر کہا کہ تم اس کو بچپن میں بہت پسند کرتے تھے اور اس سے کھیلتے تھے، اس لیے یہ تمہارے لیے لایا ہوں۔ یہ سن کر اور دیکھ کر وہ بہت شرمندہ ہوئے، کیونکہ ان کے

سامنے بڑے بڑے لوگ بیٹھے ہوئے تھے، خیال کیا ہوگا کہ یہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچیں گے کہ اس مقام پر پہنچ کر بھی یہ غبارہ کا شوقین ہے؟ الغرض ان کا چہرہ شرمندگی کی وجہ سے بدل گیا، اور لال پیلا ہونے لگا۔ جب ان کے والد نے چہرہ دیکھ کر پہچان لیا کہ وہ شرمندہ ہیں، اور اس کی وجہ سے لال پیلے ہورہے ہیں، تو کہنے لگے کہ بیٹا دیکھو! یہ چیز جو تم کو میں نے دیا ہے، اس کو تم بچپن میں ضد کر کے حاصل کرتے تھے، اور آج اسی چیز کے پیش کرنے سے تم کو شرم آرہی ہے، یہ خیال ہورہا ہے کہ میں اتنا بڑا آدمی ہوں اور مجھے یہ حقیر و بے حقیقت چیز دی جارہی ہے، یاد رکھو کہ اسی طرح کل قیامت کے دن، دنیا کی یہ باغ و بہار، یہاں کی یہ آرام و آسائش کی چیزیں، یہ دنیوی عہدے و مناصب بھی تم کو شرمندہ کردیں گے۔ لہذا ان پر ہی مت ریچھو اور اس پر فخر نہ کرو۔

صاحبو! کیسی عجیب بات کہی ہے انہوں نے، یہ ہم سب کے لیے عبرت کی بات ہے، آج ہر آدمی کو ڈگری ملنے پر، یا کوئی عہدہ ملنے پر خوشی ہوتی ہے، کوئی بلڈنگ بناتا ہے تو اسے خوشی ہوتی ہے، اور خوشی کے ساتھ وہ فخر وغرور میں مبتلا ہوجاتا ہے، دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے مگر یہ نہیں سوچتا کہ کہیں یہی چیزیں میرے لیے آخرت میں شرمندگی کا باعث تو نہیں بن جائیں گے؟ لہذا دنیا میں ایسے کام کرنا چاہئے جن پر آخرت میں شرمندہ ہونا نہ پڑے۔

ایک سوال کا جواب

فرمایا کہ ایک سالک نے پوچھا کہ کسی اچھی صورت کو دیکھ کر متاثر ہونا اور اسکا قرب پا کر خیالات میں تلاطم برپا ہونا تو فطری بات ہے، اور ہونا بھی چاہئے، ورنہ تو صحت مندی کے خلاف ہوگا، پھر اس میں خرابی و برائی کیا ہے؟

میں نے عرض کیا کہ بلا شبہ اچھی صورت کو دیکھ کر متاثر ہونا اور قرب پا کر جذبات میں ہیجان و تلاطم بپا ہونا عین فطرت ہے اور بلا شبہ صحت مندی کی علامت ہے، لیکن صورت کو دیکھنا اور اسکا قرب حاصل کرنے کی فکر کرنا اور قرب حاصل کرنا حماقت ہے، جہالت ہے، بلکہ شرارت ہے اور خباثت ہے۔

میں نے کہا کہ اس کی ایک مثال سمجھئے کہ ایک آدمی آگ میں ہاتھ ڈالتا ہے اور اس کی گرمی کا احساس کرتا ہے، تو بیشک یہ احساس علامت صحت مندی ہے، ورنہ سمجھا جائے گا کہ آدمی بیمار ہے جس کہ وجہ سے اس کو آگ کا احساس نہیں ہو رہا ہے، گرمی کا احساس نہیں ہو رہا ہے، اور کہا جائے گا کہ یہ بے حس ہے، لیکن کیا یہ سمجھنا صحیح ہوگا کہ آگ میں ہاتھ ڈالنا بھی صحت مندی ہے؟ یا یہ کہیں گے کہ آگ میں ہاتھ ڈالنے پر گرمی کا احساس تو علامت صحت مندی ہے، مگر آگ میں ہاتھ ڈالنا بے وقوفی بلکہ حماقت وجنون ہے، جیسے کوئی بے وقوف اپنی صحت مندی کا ٹسٹ کرنے کے لیے آگ میں ہاتھ ڈالدے تو کیا یہ بے وقوفی کی معراج نہیں کہالائے گی؟ لھذا صورتوں کے فتنہ سے متاثر ہونا تو صحت مندی ہے اور فطری بات ہے، لیکن اس فتنہ میں پڑنا بے حد بے عقلی وحماقت ہے۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ بعض جاہل و بے دین صوفی جو یہ کہتے ہیں کہ ہم اَمردوں اور عورتوں سے متاثر نہیں ہوتے، ان کی یہ بات دو حال سے خالی نہیں، یا تو کذب وجھوٹ پر مبنی ہے، یا صداقت پر مبنی ہے، اگر جھوٹ ہے تو اس کا نا قابل اعتبا رہونا واضح ہے، اگر صداقت پر مبنی ہے تو یہ بات ان جاہلوں اور بے دینوں کی طبعیتوں میں بے اعتدالی کی علامت ہے، اور فطرت کے خلاف ہونے کی دلیل ہے، جو کسی صورت میں بھی کمال نہیں بلکہ خلافِ کمال ہے، اگر کسی غلبہ حال کی بنا پر یہ کیفیت ہے

تو صاحب حال گو جاہل و بے دین نہ ہو، بلکہ دیندار ہو، مگر پھر بھی یہ کمال نہیں، بلکہ زیادہ سے زیادہ اس کو معذور قرار دیا جا سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استحضارِ موت

حدیث میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیت الخلاء تشریف لے جاتے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم قضاء حاجت کے بعد باہر نکل کر تیمّم کرنے لگتے، تو ابن عباسؓ فرماتے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ذرا اور آگے تشریف لے چلیں وہاں پانی ہے وضو فرمالیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ ابن عباس! ''لا أدري لعلّي لا أبلغهُ'' کیا اُمید ہے کہ وہاں جانے تک زندہ رہوں گا؟

(مسند احمد: ۱/۲۸۸، معجم کبیر طبرانی: ۱۲/۲۳۸، الزهد لابن المبارک: ۱/۹۹)

دیکھئے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنا موت کا استحضار تھا، حالانکہ انبیاء کی موت اُن کی اجازت کی بغیر نہیں آتی، پھر آپؐ نے یہ جو فرمایا کہ کیا خبر میں وہاں تک پہنچ کر وضو کرلوں گا، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو تو معلوم تھا کہ فرشتہ میری اجازت کے بغیر روح قبض نہیں کرے گا، مگر آپ اُمتیوں کو اپنے عمل سے استحضارِ موت کی تعلیم دینا چاہتے تھے کہ ایسا استحضار رکھو۔

زہد و عبادت کا غرور زہر قاتل

فرمایا کہ حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ سے ایک شیخ نے اپنے احوال لکھ کر علاج دریافت کیا، سوال کا حاصل یہ تھا کہ ''میں اگر ریاضت و عبادت کرتا ہوں تو نفس میں فخر و غرور پیدا ہوتا ہے، اور یہ خیال آتا ہے کہ میرے جیسا کوئی نیک نہیں ہے، میں بہت بڑا اور نیک ہوں، اور اگر مجھ سے کوئی گناہ ہو جاتا ہے، اور خلاف شرع

کوئی کام کر بیٹھتا ہوں، تو اپنے آپ کو ذلیل وخوار اور بدترین خلائق تصور کرتا ہوں، اس حالت کا علاج بتایا جائے؟

اس خط کے جواب میں حضرت امام ربانی مجددالف ثانی نے جو جواب تحریر فرمایا، وہ ہر ایک کے لئے عموماً اور سالکین راہِ طریقت کے لئے خصوصاً آب حیات سے کم نہیں، جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ گناہ کرنے کے بعد جو عاجزی وخواری، انکساری ومسکنت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، یہ دراصل گناہ پر ندامت وافسوس کا نتیجہ ہے، جو کہ اللہ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے، اور بہت اچھی حالت ہے، کیوں کہ گناہ کے بعد ندامت بھی پیدا نہ ہونا اور گناہ سے لذت گیر ہونا، گناہ پر اصرار کے مترادف ہے، اور اگر چھوٹے گناہ پر اصرار ہو تو وہ کبیرہ گناہ ہو جاتا ہے، اور کبیرہ گناہ پر اصرار کفر کی دہلیز ہے، لہذا آپ کو گناہ کے بعد جو ندامت ہوتی ہے، اس نعمت پر شکر ادا کرنا چاہئے۔

امام ربانی نے فرمایا کہ نیکی کرنے کے بعد جو غرور وتکبر پیدا ہوتا ہے، یہ زہر قاتل ہے اور لا علاج ومہلک مرض ہے، جو نیک اعمال کو اسی طرح نیست ونابود کر دیتا ہے جس طرح خشک لکڑیوں کو آتش جلا کر تباہ کر دیتی ہے، فرمایا کہ اس حالت کے مقابلہ میں پہلی حالت کہ گناہ کر کے شرمندہ ہو، بہت بہتر اور عمدہ حالت ہے۔

مجدد صاحب فرماتے ہیں کہ یہ غرور اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ عمل کرنے والے کی نگاہ میں اپنے اعمال نہایت خوش نما معلوم ہوتے ہیں اور وہ ان کو اچھا سمجھتا ہے، اس لئے اس کا علاج اس کی ضد سے کرنا چاہئے، لہذا اپنی نیکیوں کو ناقص ونا خالص سمجھے اور ان کے پوشیدہ عیبوں کو نگاہ میں رکھے، اور اپنے کو قاصر سمجھے۔

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں یہ کبھی خیال نہ کرنا چاہئے کہ اپنی نیکیوں میں کوئی عیب وکمی نہیں ہے، اگر تھوڑی بھی توجہ کرے گا تو اللہ کی توفیق سے اپنی نیکیوں میں سرتا

پا عیب دیکھے گا اور حسن کا شائبہ بھی محسوس نہ ہوگا، پھر غرور کیسا اور نخوت کیسی، بلکہ اپنے اعمال میں قصور ونقصان ہونے کا اتنا غلبہ ہو کہ نیکی کرنے کے بعد شرمندہ و نادم ہو، نہ کہ مغرور و بے پرواہ۔ (مکتوب نمبر:۵۴)

عبادت کا کفارہ سیئات ہونا صغیرہ کے ساتھ مختص ہونے کی حکمت

مختلف عبادات کے بارے میں احادیث سے ثابت ہے کہ وہ کفارۂ سیئات ہوتے ہیں، علماء نے ان احادیث کو صغیرہ گناہوں پر محمول کیا ہے اس لیے کہ کبیرہ تو صرف توبہ سے معاف ہوتے ہیں، بندہ کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ شاید اس کی حکمت یہ ہے کہ کبیرہ وصغیرہ ہر گناہ میں اصل تو یہی ہونا چاہئے کہ آدمی توبہ کرے، اور بغیر توبہ کے کوئی گناہ بھی معاف نہ ہو، نہ چھوٹا نہ بڑا، مگر اس میں دشواری یہ تھی کہ بہت سے گناہ صغیرہ آدمی سے چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، آسانی کے ساتھ اس طرح سرزد ہو جاتے ہیں کہ اس کو احساس تک نہیں ہوتا کہ میں نے کوئی گناہ کیا ہے، اور وہ بے خبری اور بے شعوری میں ان میں ملوث ہو جاتا ہے، اگر ان کو توبہ پر موقوف رکھا جاتا تو شاید ہی ہم کبھی ان سے بری ہوتے اور توبہ کر کے ان سے پاک ہوتے، اس لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے محض رحمت و شفقت کی بناء پر مختلف عبادات و نیکیوں کو ہمارے صغیرہ گناہوں کا کفارہ بنا دیا گیا، اس کے برخلاف کبیرہ گناہ چند ایک ہیں، اور ان کا معلوم ہونا اور احساس ہونا بعید از قیاس نہیں، لہذا وہاں شرط توبہ برقرار رکھی گئی۔

الدنیا سجن المومن کی عجیب تشریح

حدیث میں آتا ہے کہ (الدنیا سجن المومن و جنۃ الکافر) کہ دنیا

مومن کے لئے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنت۔

(مسلم:۲۹۵۶،ترمذی:۲۳۲۴، ابن ماجہ: ۴۱۱۳،صحیح ابن حبان:۲/۴۶۳،مستدرک حاکم:۳/۶۹۹،مسند احمد:۲/۳۲۳)

اس کی مختلف توجیہات حضرات علماء نے بیان فرمائی ہیں،مگر ایک تفسیر صوفیا کرام نے بیان فرمائی ہے،وہ نہایت لذیذ بھی ہے اور بہت عجیب بھی،وہ یہ کہ یہاں حدیث میں قید سے مراد وہ قید نہیں،جس سے ایذاء وتکلیف مقصود ہوتی ہے، بلکہ یہ قید ایسی ہے،جیسے طوطے اور بلبل کو قید کرتے ہیں کہ ان کی میٹھی بولی اور لطیف آواز کو سنا کریں گے،اور ان سے لطف لیں گے،اس کے برخلاف کوّے کو کوئی قید نہیں کرتا، بلکہ قید میں آئے بھی تو اس کو آزاد کر دیتا ہے،اسی طرح اللہ تعالی مومن کی فریاد و نالہ کو سن کر خوش ہوتے ہیں اور اس نالہ کو بار بار سننے کے لئے اس کی حاجات کو وہ فوری طور پر پوری نہیں کرتے، بلکہ اس کو اپنی قید میں مقید کر دیتے ہیں،تا کہ یہ اپنی میٹھی آاواز سے اللہ کو بار بار پکارے،اور اللہ تعالے اس کی آواز کو سنیں،اس کے برخلاف کفار کی پکار خدا کو پسند نہیں ہے اور اللہ کے نزدیک اس کی آواز نہایت بھونڈی معلوم ہوتی ہے،جیسے کوے کی آواز بھونڈی ہوتی ہے اور کوئی اس کو سننا بھی پسند نہیں کرتا،اسی طرح اللہ تعالے کفار کی بھونڈی آواز سننا پسند نہیں کرتے، لہذا جب وہ اللہ کو اپنی حاجات میں پکارتے ہیں تو فوری طور پر ان کی حاجات کو پورا کر دیتے ہیں تا کہ یہ اپنی بھونڈی آواز بند کر دیں اور یہاں سے دفع ہو جائیں۔

مولانا روم فرماتے ہیں کہ اگر کسی عاشق مزاج کے پاس دو عورتیں مانگنے آئیں، ایک ہو بوڑھی اور بدصورت و بھونڈی،اور دوسری جوان وخوبصورت،تو وہ بوڑھی کو جلدی سے کچھ دے کر بھگا دیگا،مگر خوبصورت عورت سے کہے گا کہ ابھی بیٹھو

، پھر دیں گے، روٹی پک رہی ہے، اسی طرح ہزار بہانے کرے گا تا کہ اس سے لطف اندوز ہو، فرماتے ہیں کہ اسی طرح اللہ تعالی مومن کو قید کرتے ہیں کہ اس سے وہ خوش ہیں۔ اور کافر کو جلدی دیکر بھگا دیتے ہیں کہ اس کو ناپسند کرتے ہیں۔

واقعی عجیب تفسیر ہے ،اور اس سے بڑی ڈھارس بندھتی ہے کہ ہماری دعائیں جو دیر سے قبول ہوتی ہیں، یہ بھی اللہ تعالے کی عنایت وشفقت ومہربانی ہے کہ وہ ہماری پکار کو سننا چاہتے ہیں، اس لیے ذرا دیر سے عطاء فرماتے ہیں۔

درجات قرب، ایک اہم تنبیہ

فرمایا کہ بادشاہ کے دربار میں حاضر باش، وزیروں اور کارندوں اور ارباب دانش وبینش واصحاب فضل وکمال لوگوں کو بادشاہ کا جو قرب اور رضا حاصل ہوتی ہے، وہ بالکل عیاں ہے، اب اگر بادشاہ ذی جاہ کسی وزیر ومشیر کو کسی کام پر مقرر کر کے دور کسی مقام پر روانہ کردے تو یہ بظاہر بادشاہ سے دوری ہے، لیکن درحقیقت یہ دوری نہیں، بلکہ قرب ہی کا ایک درجہ ہے، اوراس ظاہری دوری کے وقت بھی بادشاہ کی رضا اس شخص کو حاصل ہے، البتہ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ پہلی صورت بلا واسطہ قرب کی ہے اور دوسری صورت بالواسطہ قرب کی ہے۔

بعینہ اسی طرح اللہ تعالے سے قرب کے دو درجے ہیں ،ایک قرب بلا واسطہ، دوسرا قرب بالواسطہ، قرب بلا واسطہ مثال کے طور پر یہ ہے کہ کوئی شخص نماز میں اللہ کے حضور کھڑا ہو، یا تلاوت یا ذکر میں مشغول ہو، یا اور کسی عبادت مقصودہ میں منہمک ہو، ان تمام صورتوں میں اس کو اللہ تعالے کا قرب بلا واسطہ حاصل ہوتا ہے، لیکن کبھی اس حکیم مطلق کی حکمت تقاضا کرتی ہے کہ اس شخص کو کسی کام پر مقرر کیا جائے ،اور حکم ہوتا ہے کہ ماں باپ کی خدمت کرو، بیوی بچوں کے نفقہ کا انتظام کرو،

رشتہ داروں سے ملاقات کرو، مہمانوں کی خدمت کرو، تجارت یا ملازمت کے لئے جاؤ، یا دینی کام کے لئے نکلو، مثلا درس وتدریس کا کام کرو، دعوت وتبلیغ کے لئے لوگوں سے ملو، وغیرہ، پس جو شخص حکم شرع کے مطابق ان کاموں میں لگتا ہے، بظاہر تو وہ عبادات سے دور ہوا، لیکن فی الواقع یہ بھی قرب خداوندی کا بالواسطہ درجہ ہے، اگر بادشاہ کا وزیر یا مشیر دربار سے دور ہو کر دور نہیں، بلکہ بادشاہ سے قریب اور اس کی رضا کا مستحق ہے، تو یہ اللہ کے حکم کے مطابق مختلف خدمتوں میں لگا ہوا آدمی بھی ان تمام خدمتوں میں لگ کر خدا سے دور نہیں ہوا، بلکہ قرب ورضاء خداوندی کی دولت سے بالواسطہ طور پر مشرف ومالا مال ہے۔

مگر میں یہاں ایک اہم بات پر تنبیہ کرنا چاہتا ہوں ،اور بالخصوص سالکین کے لیے اس کو سمجھنا لازمی بات ہے، وہ یہ کہ قرب بالواسطہ میں بھی اللہ کی رضا وقرب حاصل ہونے کے باوجود یہ بات بدیہی طور پر معلوم ہوتی ہے کہ بلا واسطہ قرب ہی اصل ہے،اور بالواسطہ قرب اصل نہیں ہے، نیز یہ بھی واضح ہے کہ بلا واسطہ قرب کو علی الاطلاق فضیلت حاصل ہے، جب کہ بالواسطہ قرب کو علی الاطلاق فضیلت حاصل نہیں، بلکہ یہ بعض حالات وبعض اشخاص کے لئے بعض حِکم اور مصالح کے پیش نظر افضل ہو جاتا ہے، جیسے بادشاہ کے دربار کی حاضری تو ہر صورت میں افضل ہے، لیکن دربار چھوڑ کر کسی اور کام پر جانا اور لگنا ہر صورت میں فضیلت نہیں رکھتا، بلکہ خاص حالات وبعض اشخاص کے لحاظ سے اس میں فضیلت پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً بادشاہ کو کسی مصلحت سے اپنے وزیر کو کسی دوسرے ملک کا سفیر بنا کر بھیجنا پڑا، تو اب اس وزیر کے حق میں اس حکم کی تعمیل میں بادشاہ سے دور ہو کر دوسرے ملک کو جانا، اور اس کام کو انجام دینا افضل ہے،اور اس کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے۔ الغرض یہ قرب کی دوسری

صورت نہ علی الاطلاق افضل ہے اور نہ سب کے لیے افضل ہے۔

لہذا دونوں قسم کے قرب کا درجہ ایک نہیں ہوسکتا، جب یہ معلوم ہو گیا تو اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قرب بالواسطہ کی جتنی راہیں اور سبیلیں ہیں ان کو ان کے حکم اور مصالح کے پیش نظر اختیار کرنے کے بعد فوری طور پر پھر قرب بلا واسطہ کی راہ تلاش کرنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ صرف اسی قرب بالواسطہ کی صورت پر اکتفاء کر کے بیٹھ جائے۔

اس کے لئے ایک مثال عرض کرتا ہوں کہ ایک عالم وفاضل دین وعلم کی خدمت کے لئے درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کرتا ہے، اور بلا شبہ عالم وفاضل کے لئے یہ کام انتہائی اہم اور ضروری اور درحقیقت اس کا فرض منصبی ہے، لیکن یہ قرب بالواسطہ کی ایک سبیل وصورت ہے، لہذا صرف اسی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اس سے فراغت کے بعد قرب بلا واسطہ کی راہ تلاش کرنا چاہیے، مثلا ذکر ونماز، تلاوت وغیرہ عباداتِ مقصودہ کا ذوق پیدا کرنا چاہیے۔

چناں چہ حضرت نبی کریم ﷺ کو بھی اس کا حکم دیا گیا ہے: ﴿فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ، وَ إِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ﴾ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ: (إذا فَرَغْتَ مِنَ الفَرَائِضِ فَانْصَبْ فِيْ قِيَامِ اللَّيْلِ) کہ جب آپ فرائض سے فارغ ہو جائیں تو رات کی نماز (تہجد) میں مشغول ہو جایئے، لیکن بہت سے مفسرین جن میں حضرت حسن بصری، حضرت قتادہ، حضرت مجاہد وغیرہ ہیں، فرماتے ہیں کہ جب آپ تبلیغ کے کام سے، یا جہاد یا قتال سے اور مخلوق کی خدمات سے فارغ ہو جائیں تو رب کی عبادت میں مصروف ہو جائیں۔

(قرطبی ۱۰۹/۲۰، معالم التفسیر: ۴۶۶، درمنثور: ۵۵۲/۸)

حضرت جنید بغدادی نے فرمایا کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ" **اذا فرغت من امر الخلق فاجتهد فی عبادة الحق** "یعنی جب آپ خلق کے کام سے (جس میں تبلیغ ودعوت ، درس ووعظ ، نیز ملی وسیاسی امور سب داخل ہیں) فارغ ہو جائیں تو اللہ کی عبادت میں لگ جائیں ۔ (قرطبی: ۱۰۹/۲۰)

آج عام طور پر علماء میں یہ کوتاہی مشاہد ہے (الا ماشاء اللہ) کہ صرف قرب بالواسطہ پر اکتفاء کئے ہوئے ہیں ، اور اصل قرب کی طرف توجہ نہیں ہے۔ کوئی درس و تدریس میں لگا ہے تو بس اسی پر اکتفاء کئے ہوئے ہے اور کوئی وعظ وتقریر میں لگا ہے تو وہ اسی پر بس کئے ہوئے ہے، کوئی تحقیقی کام میں لگا ہے تو وہ اسی کو اپنی معراج سمجھا ہوا ہے۔

پھر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ درس وتدریس ، وعظ وارشاد، قضاء وافتاء وغیرہ مناصب بھی قرب بالواسطہ ہونے کے لئے شرط یہ ہے کہ یہ سب کام محض رضائے الٰہی کے لئے ہوں ، ورنہ یہ سب کام بجائے قرب کے ، ذریعۂ بعد ہونگے ، لہذا اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ تمام اُمور کی انجام دہی کی فکر کرنا چاہیے۔

یحیٰ بن معین کا استحضار موت

فرمایا کہ محدث محمد بن فضل اور محدث یحییٰ بن معین دونوں اپنے زمانے میں فن حدیث کے بڑے ائمہ مانے جاتے ہیں، ایک بار یحیٰ بن معین کو محمد بن فضل سے ایک حدیث لینی تھی ، چنانچہ یحیٰ بن معین ، محمد بن فضل کے پاس پہنچے اور حدیث سنانے کی گذارش کی ، تو وہ سنانے لگے، اور سند بیان فرمائی کہ" **حدثنا حماد بن سلمة** " (کہ مجھ سے حماد بن سلمہ نے حدیث بیان کی) تو یحیٰ بن معین نے کہا کہ حضرت! میں زبانی نہیں ، بلکہ آپ کی کاپی سے سننا چاہتا ہوں، تو محمد بن فضل کہنے

لگے میری کاپی اندر کمرہ میں رکھی ہے، لاتا ہوں، یہ کہہ کر اندر جانے لگے، تو یحیٰ بن معین نے ان کے کپڑے پکڑ لئے اور کہا کہ حضرت! پہلے آپ زبانی ہی سنا دیجئے، کیا خبر کہ آپ کے اندر سے کاپی لانے تک زندہ بھی رہوں گا یا نہیں، اس لئے پہلے زبانی ہی سنا دیجئے، پھر اگر اللہ نے زندگی دی تو کاپی سے بھی سن لوں گا۔ اس واقعہ کو شمائل ترمذی میں امام ترمذی نے رسول اللہ ﷺ کے لباس کے سلسلہ کی ایک حدیث کے درمیان میں ضمناً ذکر کیا ہے۔ (شمائل ترمذی: ص: ۵)

اس طرح موت کا استحضار ہوگا تو زندگی میں انقلاب پیدا ہو جائے گا، اس لئے کہ موت کا استحضار نہیں ہوتا تو انسان یہ سمجھتا ہے کہ کل توبہ کرلوں گا، آئندہ توبہ کرلوں گا، اس طرح ٹالتا رہتا ہے، اگر موت کا استحضار ہو تو ایسا نہیں ہوگا۔

آج دنیا میں بڑے اللہ والے کیوں نہیں؟

ایک مرتبہ احقر (مرتب) نے حضرت والا سے عرض کیا کہ حضرت! آج دنیا میں حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب جیسے بڑے بڑے اللہ والے کیوں نہیں ہیں؟ تو حضرت نے فرمایا کہ آج بھی ایسے اللہ والے موجود ہیں، مگر لوگ غلطی یہ کرتے ہیں کہ اللہ والے جب آخری عمر میں پہنچ کر ساری دنیا میں چمکتے ہیں، شہرت پا لیتے ہیں، تب ان کو جانتے یا مانتے ہیں اور ان کی طرف رجوع کرتے ہیں، شروع سے ان کو عام طور پر لوگ نہیں پہچانتے، خود حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب علیہ الرحمۃ اور حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب دامت برکاتہم کو ان کی جوانی میں کون جانتا پہچانتا تھا، حالانکہ وہ اس وقت بھی بڑے اللہ والے تھے، یہی کیا ان کے بھی اکابر حضرت گنگوہی، حضرت تھانوی و حضرت نانوتوی سب کے ساتھ لوگوں نے ایسا ہی کیا ہے، ہاں جن کی

آنکھیں ہوتی ہیں وہ اسی وقت ان کو پہچان لیتے ہیں اور اسی وقت رجوع کرتے ہیں اور منزل مقصود کو پہنچ جاتے ہیں، پھر فرمایا کہ شہرت حاصل ہو جانے کے بعد پہچاننا اور اصلاح کے لئے رجوع کرنا کوئی خاص بات نہیں، اس وقت تو سب کرتے ہیں، کمال تو یہ ہے کہ شہرت سے پہلے ہی اللہ والوں کو پہچانا جائے اور ان کی طرف رجوع ہوکر اپنی اصلاح کرائی جائے، اس سے اخلاص کا پتہ چلتا ہے، اور شہرت کی بنیاد پر کسی کی طرف رجوع کرنے میں ہوسکتا ہے کہ نفس کا کوئی کید پوشیدہ ہو، اور جو ان اغراض فاسدہ کو دل میں لئے ہوئے اولیاء اللہ سے رجوع کرتے ہیں، وہ کامیاب نہیں ہوتے، بہت سے لوگ اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بغیر اصلاح کے یوں ہی زندگی گذار دیتے ہیں۔

تمت بالخیر

نظم

تحفة السالكين

از: محمد شعیب اللہ خان

اصلاح کی ہو خواہش تو تم یہ کام کرلو
اول قدم میں خود کو رب کا غلام کرلو
تم ذکر وفکر رب میں تن من سبھی لگادو
غفلت کی زندگی کو خود پر حرام کرلو
مخفی رہے نہ تم سے، راز حیاتِ قلبی
بچنے کا تم گناہوں سے اہتمام کرلو
اخلاق کو سنو اور، عادات کو بنالو
اس کے لئے صحیح و محکم نظام کرلو
شیطان کی وجہ سے رستہ یہ پر خطر ہے
چلنے کو ایک رہبر کا انتظام کرلو
خواہش اگر ہو تم کو محبوب رب بنو تم
جاری زباں پہ اپنی مالک کا نام کرلو
حاصل ہو نیک صحبت اس کا دھیان رکھنا
صحبت کی تم بروں کی ایکدم سلام کرلو
سالک بغیر تقویٰ رہتا نہیں ہے زندہ
یہ بات دل میں رکھ کر اصلاح تام کرلو

اللہ سے تعلق اس راہ کا ہے مقصد
اس کے حصول میں تم کوشش تمام کرلو
ملتی نہیں ہے یوں ہی اللہ کی محبت
اس کے لئے ریاضت تم صبح وشام کرلو
ناکام ہے یہاں پر لذّات کا پجاری
خود پر حرام تم ہی مینا وجام کرلو
پاتا نہیں خدا کو جو نفس کا ہو تابع
نفس شریر وسرکش کی روک تھام کرلو
یہ عرض مخلصانہ ظفرؔ نے پیش کی ہے
اس کا نصیحتوں میں تم انضمام کرلو